مقالاتِ شبلیؒ

جلد پنجم

مرتبہ

مولانا سید سلیمان ندویؒ

دیباچہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقالات شبلی کے جو حصے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں ان سے اگر چہ اس غلط خیال کی تردید ہو چکی ہ کہ مولینا شبلی مرحوم تاریخ کے سوا اور کوئی فن نہیں جانتے تھے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ ان کا خاص فن تھا اور تاریخی کتابوں کے علاوہ انہوں نے بہت ے تاریخی عنوانات پر نہایت کثرت سے مضامین لکھے تھے جن کی دو جلدیں رسائل شبلی و مقالات شبلی کے نام سے ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد بھی وہ اس قسم کے دوسرے تاریخی عنوانات پر مضامین لکھتے رے جو زیادہ تر الندوہ میں شائع ہوئے ہیں۔

ان مضامین کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ مضامین تو مشہور لوگوں کے سوانح حیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کچھ کسی خاص تاریخی مسئلہ پر لکھے گئے ہیں۔ لیکن اگر ان تمام مضامین کو ایک رکھتے ہیں اور کچھ کسی کاص تاریخی مسئلہ پر لکھے گئے ہیں۔ لیکن اگر ان تمام مضامین کو ایک ہی جلد میں شائع کر دیا جاتا تو اس کی ضخامت بہت زیادہ بڑھ جاتی اور مضامین کی وحدت اور یکرنگی میں فرق آجاتا ہے۔ اس لیے ان مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں صرف اکابر اسلام کے سوانح حیات کے متعلق مضامین درج کیے گئے ہیں اور یہی حصہ اس وقت شائع کیا جا رہا ہے دوسرے حصہ میں وہ مضامین درج کیے جائیں گے جو کسی تاریخی مسئلہ کے متعلق ہیں اور یہ جلد اس کے بعد شائع ہو گی۔

اس جلد کے تمام مضامین الندوہ سے لیے گئے تھے صرف ایک غیر مطبوعہ مضمون جو معارف میں ان کی وفات کے بعد شائع ہے۔ معارف سے لیا گیا ہے۔

سید سلیمان ندوی
دارالمصنفین، اعظم گڑھ

۱۶ جنوری، سنہ ۱۹۳۶ء

☆☆☆

حضرت اسماء

اخلاق عرب

ایک نکتہ داں شخص نے کس قدر سچ کہا ہے کہ ''ہم کو صرف یہی رونا نہیں ہے کہ ہمارے زندوں کو یورپ کے زندوں نے مغلوب کرلیا ہے۔ بلکہ یہ رونا بھی ہے کہ ہمارے مردوں پر بھی یورپ کے مردوں نے فتح پا لی ہے''۔ ہر موقع اور ہر محل پر جب شجاعت' ہمت' غیرت' علم وفن غرض کسی کمال کا ذکر آتا ہے تو اسلامی ناموروں کے بجائے یورپ کے ناموروں کا نام لیا جاتا ہے۔

اس کی وجہ یہ نہیں کہ قوم سے قومی حمیت کا مادہ بالکل جاتا رہا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید تعلیم میں ابتدا سے اخیر تک اس بات کا موقع ہی نہیں ملتا کہ اسلاف کے کارناموں سے واقفیت حاصل کی جائے۔ اس لیے جب فضائل انسانی کا ذکر آتا ہے تو خواہ مخواہ انہی لوگوں کا نام زبان پر آتا ہے جن کے واقعات کی آوازیں کانوں میں گونج رہی ہیں' اور یہ وہی یورپ کے نامور ہیں

یہ سلسلہ مضامین اسی غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کو عربی زبان پر دسترس نہ ہونے کی وجہ سے اسلاف کے کارناموں سے اطلاع نہیں وہ رفتہ رفتہ ان واقعات ان واقعات سے واقف ہو جائیں۔ اس وقت خود بخود یہ حالت پیدا ہو گی کہ یورپین ناموں کے

ساتھ عرب کے مقدس نام بھی ہمارے نوجوانوں کی زبانوں پر ہوں گے۔

عورتوں کا استقلال وثبات ودلیری وآزادی

حجاج بن یوسف نے جب عبداللہ ابن زبیرؓ کا مکہ معظّمہ میں محاصرہ کیا اور ہر طرف سے رسد وغیرہ کی بندی کر دی تھی تو عبداللہ بن زبیرؓ کی جمیعت میں کمی ہونی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ چند مہینوں کے بعد ان کے ساتھ صرف گنتی کے آدمی رہ گئے۔ وہ اپنی ماں کے پاس گئے اور کہا کہ اب میں مقابلہ سے عاجز آ چکا ہوں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا میں حجاج سے صلح کرلوں؟ وہ بولیں کہ ”جان مادر! اگر تم ناحق پر تھے تو تم نے یہی بڑی غلطی کی کہ آج تک اپنی غلطی پر قائم رہے۔ اب یہ دوسری غلطی ہے کہ اب بھی اپنی ضد پر قائم ہو لیکن اگر تم حق پر تھے تو حق سے کسی حالت میں باز نہیں آنا چاہیے“ عبداللہ بن زبیرؓ کو چونکہ اپنے برسرحق ہونے کا یقین تھا۔ عزم کرلیا کہ لڑ کر مر جائیں گے۔ باہر آ کر اسلحہ جنگ منگوائے اور ہتھیار سج کر ماں سے رخصت ہونے کے لیے دوبارہ گھر میں گئے۔ ماں سے کہا کہ آخری رخصت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ انہوں نے گلے سے لگا لیا۔ عبداللہ بن زبیرؓ کے کپڑوں کے نیچے زرہ تھی۔ گلے لگانے میں ان کو سختی محسوس ہوئی تو پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے بولے کہ زرہ انہوں نے کہاں جان مادر! جو لوگ جان پر کھیلتے ہیں وہ زرہ نہیں پہنتے۔ انہوں نے زرہ اتار کر پھینک دی۔ چلتے ہوئے ماں سے کہا کہ مجھ کو جو کچھ رنج ہے وہ صرف یہ ہے کہ حجاج میری لاش کا مثلہ کرے گا۔ یعنی ناک کان کٹوائے گا بولیں ک بکری جب ذبح ہو چکتی ہے تو پھر اس کو کھال کے کھینچے جانے کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی' ماں سے رخصت ہو کر حرم کعبہ میں گئے۔

ساتھیوں سے

ا۔ عبداللہ بن زبیرؓ بڑی عظمت وجلال کے صحابی تھے۔حضرت امام حسینؑ کے بعد انہوں نے خلافت کا دعویٰ کیا اور ایک مدت تک بنو امیہ کے حریف کے مقابل رہے۔اکثر مورخین ان کو خلیفہ پنجم لکھتے ہیں۔

کہا کہ ت سے جو بن آئے کرو میں تو اب پہلی صف میں ملوں گا۔ یہ کہہ کر حملہ کیا اور پہلے ہی حملہ میں دشمن کی صف اول الٹ دی۔لیکن دشمنوں نے اس قدر پتھر برسائے کہ ان کی پیشانی زخمی ہوئی خون بہ کر قدموں میں گرا تو یہ شعر پڑھا:

فلسنا علی الاعقاب نذمی کلومنا

ولکن علی اقدامنا تقطر الدم

ہمارے زخموں کا خون ہماری پیٹھ پر نہیں

بلکہ ہمارے قدم پر ٹپکتا ہے

آخر بڑی شجاعت سے لڑ کر شہید ہوئے۔حجاج نے ان کی لاش سولی پر لٹکا دی۔ لوگوں نے کہا کہ ان کی ماں کے پاس بھجوا دیجیے۔حجاج نے کہا ان کی ماں خود مانگ بھیجیں تو بھیجدوں۔لوگوں نے ان کی ماں سے آکر کہا۔وہ سن کر چپ ہو رہیں چند روز کے بعد اتفاقاً اس طرف سے گزریں۔بیٹے کی لاش سولی پر لٹکی دیکھی تو نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ:

اما آن لھذا الفارس ان تیر جل

کیا اب بھی یہ وقت نہیں آیا کہ یہ شہسوار اپنے گھوڑے سے اتر آئے۔

مکہ معظّمہ جب فتح ہوا تو کثرت سے لوگ اسلام لاتے جاتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرتے جاتے تھے۔جب عورتوں کی باری آئی تو ہند (امیر

معاویہؓ کی ماں) نقاب ڈال کر آئی۔ بیعت کے وقت جن باتوں کا اقرار لیا جاتا تھا‘ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو پیش کیا تو یہ گفتگو ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم: تم اقرار کرو کہ شرک نہ کرو گی۔

ہند: آپ تو ہم سے ان باتوں کا اقرار لیتے ہیں کہ مردوں سے نہیں لیتے اچھا ہم اقرار کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم: اور یہ کہ چوری نہ کرو گی۔

ہند: میں ابوسفیان کے مال سے دو چار آنے چوری سے لے لیا کرتی تھی‘ کیا یہ بھی حرام ہے؟ ابوسفیان برابر سے بولے کہ اس کو میں نے خود معاف کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم: اور یہ کہ تم زنا نہ کرو گی۔

ہند: کیا شریف عورت بھی ایسا کرتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم: اور یہ کہ اپنی اولاد کو نہ مار ڈالو گی (دختر کشی کی طرف اشارہ تھا)

ہند:

قدر بینا ھم صغاراً وقتلتھم یوم بدر کباراً فانت وھم اعلم ۱

ہم نے ان کو بچپن سے پالا تھا۔ جب بڑے ہوئے تو آپ نے بدر کی لڑائی میں ان کو مار ڈالا۔ تو آپ اور وہ باہم سمجھ لیجیے۔

عرب کی آزاد پسندی دیکھو کہ اس پر صحابہؓ نے برا نہیں مانا۔ بلکہ حضرت عمرؓ باوجود تصلب اور سخت مزاجی کے ہنس پڑے۔

۱۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۶۶۳

☆☆☆

المعتزلہ والاعتزال

اسلام کے ان بہت سے فرقوں سے جن کی تعداد کو ایک پیشن گوئی کے پورا کرنے کے لیے تہتر تک پہنچایا گیا ہے۔صرف چار فرقے ہیں جن کو زیادہ تر کامیابی ہوئی اور جو مدت تک موجود رہے۔یعنی سنی' شیعہ' معتزلہ' باطنیہ۔ان میں سے دو آخر الذکر آج بالکل معدوم ہیں معتزلہ اگر چہ دنیا سے ناپید ہو گئے لیکن ایک مدت تک ان کو بہت عروج رہا بڑے بڑے نامور مصنفین ان میں پیدا ہوئے۔مشہور خلفاء اور سلاطین نے فخریہ اس لقب کو اختیار کیا۔متعدد علوم اسی فرقہ کی بدولت عالم وجود میں آئے۔غرض وہ خود اگر چہ دنیا میں نہیں رہے۔لیکن مذہب میں علم میں تصنیف میں۔لٹریچر میں ان کی بہت سی یادگارں اب بھی موجود ہیں اور زمانہ ان کو آئندہ بھی مٹا نہیں سکتا۔البتہ افسوس ہے کہ ان کے مٹنے کے ساتھ ان کی تاریخ بھی مٹتی چلی جاتی ہے اور ایک ایسے مشہور فرقہ کے واقعات کا معدوم ہو جانا تاریخی دنیا کا بہت بڑا افسوسناک حادثہ کہا جا سکتا ہے اس لحاظ سے خیال ہوا کہ معتزلہ کے متعلق ایک مختصر سا مضمون جس میں مذہب اعتزال کی ابتدا اور اس کی اشاعت ہر بعہد کی ترقیاں' ترقی وتنزل کے اسباب' مشہور معتزلیون کے مختصر حالات' اعتزال کے مسائل اور ان پر ریویو' دوسرے فرقوں پر اس مذہب کا اثر' اور اس قسم کے امور لکھے جائیں۔اس مضمون کا یہ پہلا ٹکڑا ہے جس میں اعتزال کی اجمالی تاریخ ہے۔اور ٹکڑے وقتاً فوقتاً تہذیب الاخلاق میں شائع ہوں گے۔

اعتزال اگر چہ اور مذاہب کی طرح صحابہ کے اخیر زمانہ مُں پیدا ہوا۔لیکن اس کے

ابتدائی آثار عین شروع اسلام میں موجود تھے۔ حقیقت یہ ہے ہ ان مذاہب میں سے کسی مذہب کی نسبت خصوصیت کے ساتھ یہ کہنا کہ وہ فلاں زمانہ میں پیدا ہوا ایک قسم کی ناانصافی ہے یا تو یہ کہنا چاہیے کہ ابتدائے اسلام یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کے زمانہ میں تسنن، اعتزال، قدر، کوئی مذہب موجود نہ تھا۔ یا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ تمام مذاہب اسی زمانہ میں پیدا ہو چکے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک اسلام ایک نہایت اجمالی اور سادہ چیز تھی۔ یعنی عقائد میں کلمہ توحید اور اعمال میں فرائض خمسہ عقائد کی سادگی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کچھ زمانہ تک قائم رہی۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ساتھ روم و فارس کی مہمات شروع ہو گئیں۔ اور عرب کی دماغی اور عملی قوت کا سارا زور مہمات ملکی کی طرف مصروف ہو گیا۔ ان معرکہ آرائیون میں کلمہ توحید کا اجمالی مسئلہ تو ہمیشہ تازہ رہا کیونکہ جن قوموں پر حملے کئے جاتے تھے ان کے سامنے جنگ سے پہلے یہی مسئلہ پیش کیا جاتا تھا لیکن وہ اسی حد تک تھا کہ خدا ہے۔ یہ تفصیل اور باریک بینیاں کہ ہے تو کیا ہے؟ اس کی صفات کیا ہیں؟ اس کی قدرت کے کیا حدود ہیں؟ وغیرہ وغیرہ، اس وقت نہ پیدا ہوئیں اور نہ ہو سکتی تھیں۔

تاہم صحابہ میں چونکہ ایک گروہ ایسا بھی تھا جو علمی اشغال میں مصروف تھا اور جنکو مہمات ملکی سے بہت کم تعلق رہتا تھا۔ اس لیے عقائد میں کسی قدر بحث و تدقیق شروع ہو گئی اور مختلف فرقوں کی وجود کی گویا بنیاد قائم ہوئی۔ صحابہ کے زمانے تک عقائد میں جو اختلافات پیدا ہوئے ان میں سے چند یہ ہیں:

اکثر صحابہ معراج جسمانی کے قائل تھے۔ حضرت عائشہؓ کو اس سے انکار تھا۔ عبداللہ بن عباس کا مذہب تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا تھا۔ حضرت عائشہؓ اس کی منکر تھیں۔

عبداللہ بن عمر سماع موتی کے قائل تھے بعض صحابہ اس کے سخت مخالف تھے۔ ابو ہریرہؓ کا عقیدہ تھا کہ عزیزوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب نازل ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ اس کی مخالف تھیں۔

عقائد کے متعلق تو انہی چند مسائل میں اختلاف ہوا۔ لیکن اعمال چونکہ محسوس پیرایہ رکھتے تھے۔ اور روزانہ ان سے کام پڑتا تھا۔ اس لیے ان میں نہایت کثرت سے اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ بعض اختلافات جو وضو اور نماز کے مسائل کے متعلق تھے ان کی تفصیل یہ ہے۔

عبداللہ بن عباسؓ: وضو میں اعضاء کو ایک ایک بار دھونا چاہیے۔

ابو ہریرہؓ: دو دو بار

ابو ہریرہؓ: آگ پر پکی ہوئی چیز کے استعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

جابرؓ: نہیں ٹوٹتا

عائشہؓ: نماز فجر منہ اندھیرے پڑھنی چاہیے۔

رافع بن حذیمؓ: اسفار کرنا چاہیے۔

عائشہؓ: عصر میں جلدی کرنی چاہیے۔

ام سلمہؓ: تاخیر کرنی چاہیے۔

انس بن مالک و ابن عمرؓ: اقامت اکہری کہنی چاہیے۔

عبداللہ بن زیدؓ: دوہری کہنی چاہیے۔

علیؓ و ابن عباسؓ و ابو ہریرہؓ: فجر میں قنوت پڑھنا چاہیے۔

ابو مالک اشجعیؓ: نہیں

ابو بکرؓ، عمرؓ، انسؓ، ابو درداءؓ: مسح علی العمامہ جائز ہے۔

بعد دیگر صحابہؓ: نہیں

اکثر صحابہؓ: مسح علی الخفین جائز ہے۔

عائشہؓ و ابن عباسؓ: جائز نہیں۔

لیکن عقائد اور اعمال کے ان اختلافات نے کسی قسم کا محسوس تفرقہ پیدا نہیں کیا سب لوگ ایک لقب یعنی مسلمان کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ دوستانہ ملتے جلتے تھے۔ حضرت علیؓ کے اخیر زمانہ تک یعنی سنہ ۳۷ھ میں جب انہوں نے امیر معاویہؓ سے صلح کر لی اور حَکَم کا فیصلہ تسلیم کر لیا۔ تو خود انکے ساتھیوں میں سے کئی ہزار آدمی ان سے الگ ہو گئے کہ لا طاعۃ لغیر اللہ یعنی مذہب کے حق و باطل کا فیصلہ ثالث اور حَکَم کی رائے پر نہیں ہو سکتا۔ یہ پہلا فرقہ تھا جو اسلام میں قائم ہوا کیونکہ ان لوگوں نے تمام مسلمانوں سے جو ان کی رائے سے موافق نہ تھے ہر طرح کی علیحدگی اختیار کی' اور ان کا عقیدہ تھا کہ جو شخص ان کا ہم عقیدہ نہیں وہ مسلمان نہیں اس مناسبت سے یہ لوگ حضرت علیؓ کے دائرہ سے خارج ہو گئے اور ان کا نام خارجی مشہور ہوا اس امتیازی نام سے اس بات کی ابتدا ہوئی کہ اختلاف آراء کی بنا پر جدا جدا فرقے قائم ہوں اور ان کے نام جدا جدا رکھے جائیں۔

یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ تمدن کی وسعت کا خود اقتضا تھا کہ اسلام کے مجمل عقائد روز بروز وسیع ہوتے جائیں۔ اور نئے نئے فرقے قائم ہوں۔ لیکن پہلے وہی فرقے قائم ہوئے جن کو پالٹکس سے بھی کچھ لگاؤ تھا۔ خارجیوں کی ابتدا اسی حیثیت سے ہوئی شیعہ فرقہ تو گویا پولیٹکل فرقہ تھا قدریہ مذہب جو ان دونوں کے بعد پیدا ہوا اور جو مذہب اعتزال کی اصل بنیاد ہے وہ بھی پولٹیکل حیثیت سے خالی نہ تھا۔ سب سے پہلے قدر کی نسبت جس نے گفتگو کی وہ معبد جہنی تھا۔ یہ بنو امیہ کا زمانہ تھا اور استحکام سلطنت کے لیے ہمیشہ

خونریزیاں کی جاتی تھیں۔ ملک میں ان سفاکیوں کی وجہ سے نہایت ناراضی پھیلی ہوئی تھی اور چونکہ اس وقت تک عرب میں آزادی کا مادہ باقی تھا وہ متعجب ہو کر افسران سلطنت سے پوچھتے تھے کہ تم مسلمان ہو کر ان خونریزیوں کو کیوں کر جائز رکھتے ہو۔ ان کی طرف سے جواب ملتا تھا کہ ہم کچھ نہیں کرتے جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے القدر خیرہ وشرہ معبد جہنی بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ حسن بصری کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس مسئلہ کے متعلق ان کی رائے دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ کذب اعداء اللہ یعنی دشمنان خدا (بنی امیہ) جھوٹے ہیں۔1

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اور مذاہب کی طرح اعتزال کے ابتدائی آثار بھی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے زمانہ میں موجود تھے۔ صحابہ میں سے اگرچہ بہت سے ایسے تھے جو مذہبی مسائل کے متعلق کچھ غور کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یا عقل کو دخل دینا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن ایسے بھی تھے جو ہر بات کو عقل کے معیار سے جانچنے یا کم سے کم یہ کہ عقل کو معاملات شرعیہ میں بیکار نہیں خیال کرتے تھے' یہی اعتزال کی اصلی بنیاد تھی جس پر آگے چل کر بڑی بڑی عمارتیں قائم ہوئیں۔

اعتزال کا سب سے پہلا مسئلہ جو مذہب اعتزال کی تاریخ کا آغاز ہے' یہ تھا کہ انسان جو برائیاں کرتا ہے خدا نہیں کراتا' اس مسئلہ کو قدر کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ معتزلیوں کا دوسرا نام بھی قدریہ بھی ہے۔ اسی مناسبت سے وہ اپنا نام عدلیہ رکھتے تھے۔ کیونکہ خدا کا عادل ماننا اس بات پر موقوف ہے کہ انسان کو اپنے افعال کا مختار مانا جائے اور معتزلہ ایسا ہی مانتے تھے۔ اس مسئل کو سب سے پہلے معبد جہنی نے شائع اور مشتہر کیا۔ اور اسی وجہ سے قدریہ کے لقب سے مشہور ہوا۔ چونکہ اعتزال اور قدریہ کے اصول پالیٹکس سے بھی ایک خفیف تعلق رکھتے تھے اور معبد علانیہ حکومت بنو امیہ کو برا کہتا تھا عبدالملک بن

مروان نے سنہ ۸۰ھ میں حجاج کے ہاتھ سے اس کو قتل کرادیا۔۲

ا۔ معارف ابن قتیبہ ص ۲۲۵ ۔ ۲۔ مقریزی ج ۲ ص ۳۵۶۔

معبد کے بعد غیلان دمشقی نے جو قبطی النسل تھا اس مسئلہ کی ترویج کی اس کے ساتھ چند اور مسائل بھی مذہب اعتزال میں شامل کر لیے۔ جن میں ایک امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی تھا۔ یہ مسئلہ حکومت کے لیے ایک پر خطر مسئلہ تھا۔ اور چونکہ غیلان نہایت بے باکی سے اس کا اعلان کرتا تھا۔ ہشام بن عبدالملک نے جو سنہ ۱۰۵ میں تخت نشین ہوا۔ دمشق میں بلا کر اس کو پھانسی دے دی۔

معبد و غیلان نے جو ارکان اعتزال تھے اگرچہ بہت کم زمانہ پایا لیکن اتنے ہی عرصہ میں اعتزال کو بہت ترقی ہوگئی۔ سینکڑوں ہزاروں آدمیوں نے یہ مذہب قبول کر لیا اور اس کے بڑے بڑے اصول مرتب ہو کر قلم بند ہو گئے۔

اسی زمانہ میں دو شخصوں نے جو اتفاق سے ایک ہی سنہ یعنی سنہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اس مذہب کو بہت زیادہ رونق دی، یعنی عمرو بن عبید اور واصل بن عطاء یہ دونوں حسن بصری کے شاگرد تھے اور ان کے حلقہ درس میں جو بصرہ کی مسجد میں منعقد ہوا کرتا تھا اکثر شریک ہوا کرتے تھے۔ ان دونوں خوارج کے ایک مسئلہ "گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے" بہت چرچا تھا۔ حسن کی مجلس میں اس کا ذکر آیا تو واصل نے کہا کہ میں ایک تیسری شق اختیار کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ مرتکب کبائر نہ مسلمان ہے نہ کافر۔ اس پر حسن نے سخت ناراضی ظاہر کی۔ واصل بن عمرو بن عبید دونوں ان کے پاس سے اٹھ کر چلے آئے اور اسی مسجد میں اپنا ایک حلقہ درس قائم کیا۔ حسن کے حلقہ سے الگ دیکھ کر لوگوں نے ان کو معتزلہ کہنا شروع کیا۔ اور

اس لقب کی ایجاد کا یہ پہلا دن ہے۔

یہ دونوں مذہب اعتزال کے دست و بازو اور فضل و کمال کے چشم و چراغ تھے واصل عرب کے نہایت مشہور بلغیوں میں شمار کیا گیا ہے۔اس کی قادر الکلامی کی ایک مثال یہ ہے کہ چونکہ وہ الثغ تھا یعنی اس کی زبان سے ''ر'' کا لفظ نہیں ادا ہوتا تھا۔اس لیے جو لیکچر دیتا تھا یا کوئی عبارت لکھتا یا بولتا تو عموماً ''ر'' سے خالی ہوتی تھی۔علم کلام کا پہلا موجد وہی ہے۔ اصول اولین اسی نے بیان کیے۔علامہ ابو ہلال عسکری نے کتاب الاوائل میں بہت سے اولیات اس کی طرف منسوب کیے ہیں۔چنانچہ لکھا ہے کہ ملحدوں کا رد اول اسی نے لکھا۔ مسائل فقیہ کے چار ماخذ قرآن' حدیث' اجماع قیاس اسی نے قرار دیے۔عام و خاص کی اصطلاح اول اسی نے قائم کی۔یہ مسئلہ کہ نسخ احکام میں ہوسکتا ہے نہ اقوال میں ۔اول اسی نے بیان کیا۔علامہ ابن خلکان نے اس کی بہت سی تصنیفات کے نام گنائے ہیں جو نہایت عمدہ مضامین پر لکھی گئی ہیں۔

عمرو بن عبید کمالات علمی کے علاوہ نہایت عابد و زاہد اور دنیا سے بے نیاز تھا۔حسن بصری سے ایک شخص نے اس کی نسبت سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ تم ایسے شخص کی نسبت پوچھتے ہو جس کی گویا فرشتوں نے ادب سکھلایا ہے۔اور انبیا نے اس کی تربیت کی ہے میں نے اس سے زیادہ کسی کے ظاہر کو باطن کے ساتھ موافق نہیں پایا۔ا۔خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں اس کا آنا اور نہایت بے نیازی اور آزادی سے گفتگو کرنا نہایت دلچسپ واقعہ ہے۔جس کا تذکرہ تمام مورخین نے کیا ہے۔اس کے مرنے پر خود مرثیہ لکھا۔اہل تاریخ کا بیان ہے کہ یہ شرف کہ خلیفہ وقت کا مرثیہ لکھنا عمرو بن عبید کے سوا دنیا میں کسی کو حاصل نہیں ہوا۔غرض واصل اور عمرو کی نکتہ آفرینی سے مذہب اعتزال نے نہایت وسعت پیدا کی۔ عدل و قدر کے علاوہ اور بہت سے دقیق مسائل مذہب اعتزال میں شامل ہو گئے۔ملک میں

ان مسائل کا زیادہ چرچا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس نے دربار خلافت میں بھی بار پایا' یزید بن ولید بن عبدالملک نے علانیہ یہ مذہب قبول کیا' اور جب ولید بن یزید نے جو سنہ ۱۲۵ھ میں تخت نشین ہوا تھا زیادہ عیاشی اور عیش پرستی شروع کی تو یزید ناقص نے امر بالمعروف کے دعوے سے جو اعتزال کے مائل کا پانچواں اصول تھا اشتہار جنگ دیا اور بہت سے معتزلہ اس کیساتھ ہو گئے ا۔ یزید نے

ا۔ ابن خلکان ترجمہ عمرو بن عبید۔ یزید کا اعتزال اور معتزلین کا اس کا ساتھ دینا مسعودی نے یزید کے حالات میں بیان کیا ہے۔

فتح حاصل کی اور ولید کو قتل کرا دیا۔ حکومت کا پایہ تھام کر اعتزال نے اور زیادہ ترقی کی ولید نے سنہ ۱۲۶ھ میں وفات پائی اور اس کے بد ۱۳۲ء میں دولت بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

دولت عباسیہ کا دوسرا بادشاہ منصور اگرچہ خود کسی خاص مذہب کے انتساب سے مشہور ہونا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ عمرو بن عبید سے جس کا ذکر اوپر گزر چکا بچپن کی دوستی تھی اور دونوں مدت تک ایک ساتھ تحصیل علم کرتے رہے تھے اس کے علاوہ عمرو بن عبید کی بے ریا خدا پرستی اور زہد و قناعت کا وہ دل سے معترف تھا۔ خود بخود اس کے عہد میں اعتزال کو ترقی ہوئی ۔ واصل بن عطا نے تمام اسلامی مما لک میں اپنے نقیب بھیج دیے کہ مذہب اعتزال کی منادی کیریں۔ عبداللہ بن الحارث کو مغرب بھیجا۔ اور بہت سے لوگوں نے مذہب اعتزال پر بیعت کی۔ حفص بن سالم کو خراسان روانہ کیا۔ وہاں جہم بن صفوان سے جو مذہب جہمی کا بانی ہے مناظرہ ہوا اور جہم نے زک پائی۔ اسی طرح ایوب کو جزیرہ' حسن بن زکوان کو کوفہ عثمان طویل کو آرمینیہ بھیجا۔ آرمیئیا میں بہت سے لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا۔

ان واقعات کے سوا ایک نہات قوی سبب اور پیدا ہوا جس نے اعتزال کا سکہ بٹھا دیا۔ منصور نے سلطنت کے استحکام سے مطمئن ہو کر علوم وفنون کی اشاعت پر توجہ دی اور پہلوی، سریانی، ہندی زبانوں سے حکمت وفلسفہ کی کتابیں ترجمہ کرائیں۔ سلطنت کے اثر سے ان ترجموں کو نہایت قبول حاصل ہوا۔ اور ملک میں فلسفیانہ مذاق کی گرم بازاری ہوگئی۔ یہود، عیسائی، پارسی جو حکومت کی رعایا تھے۔ انہوں نے اس طرف زیادہ توجہ کی اور ساتھ ہی اسلام کے مسائل پر نکتہ چینیاں شروع ہوگئیں منصور نے تلوارت کے زور سے اس کو روکنا مناسب نہ سمجھا بلکہ بحث کی عام اجازت دے دی۔ غیر مذہب والوں سے مقابلہ میں محدثین اور فقہاء اپنی روایت لے کر آئے لیکن وہاں منقولات سے کام کیا کام چلتا تھا۔ آخر معتزلہ میدان میں آئے کہ ہم مذہب کو دلائل عقلی سے ثابت کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اکثر معرکوں میں غیر مذہب والوں کو شکست دی یہ دیکھ کر کہ حمایت اسلام کے لیے مذہب اعتزال کا زیادہ کام آ سکتا ہے ملک کے ممتاز لوگوں کو اعتزال کی طرف زیادہ توجہ ہوئی اور سینکڑوں ہزاروں آدمی معتزلی بن گئے۔ منصور کے بعد مہدی نے مذہبی آزادی کو روک دیا۔ مہدی کا خلف الرشید ہارون الرشید بھی اگرچہ فلسفہ وحکمت سے بے بہرہ تھا تاہم چونکہ دربار برمکیوں کا ہاتھ میں تھا اور وہ انتہا درجہ کے آزاد خیال اور علم دوست تھے اعتزال کا قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جاتا تھا۔ اخیر میں فقہا کے اشارہ سے ہارتون نے مناظرہ کی مجلسیں قطعاً بند کرا دیں ا۔ اور ساتھ ہی معتزلہ کی ترقی بھی گویا رک گئی۔ لیکن جب مامون تخت نشین ہوا تو اس کمی کا پورا معاوضہ مل گیا۔ مامون نے خود مذہب اعتزال قبول کیا اور تمام بڑے بڑے معتزلی علماء دربار میں باریاب ہوئے۔ ابوالہذیل علاف ونظام مامون کے استاد تھے اور مامون ان کا نہایت ادب واحترام کرتا تھا۔ علاف ونظام دونوں فلسفہ وحکمت کے بڑے استاد تھیے۔ مامون کہا کرتا تھا

اظل ابو الھذیل علی الکلام کاظلال الغمام علی الانام

یعنی ابوالہذیل نے علم کلام پر اس طرح سایہ کیا ہے جس طرح بادل آدمی پر سایہ کرتا ہے۔

ہارون کی روک ٹوک اور فقیہانہ تعصب نے غیر قوموں کو یہ یقیند لایا تھا کہ مذہب اسلام عقل کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ بدگمانی یہاں تک بڑھی کہ غیر مذہب والوں کو یہ عام خیال پیدا ہو گیا کہ اسلام دنیا میں جو پھیلا وہ تلوار کے زور سے پھیلا۔ مامون نے یہ سن کر ایک عظیم الشان مناظرہ کی مجلس قائم کی تمام اطراف ملک سے ہر مذہب وملت کے پیشوا طلب کیے۔ فرقہ مانویہ کا رئیس مذہب جس کا نام یزدان بخت تھا رئے سے طلب ہو کر آیا۔ ا۔ ہر شخص کو نہایت آزادی سے گفتگو کرنے کی عام اجازت دی گئی۔ مسلمانوں کی طرف سے مامون نے ابوالہذیل علاف کو مقرر کیا۔ چنانچہ ابوالہذیل علاف نے یزدان بخت کو بالکل ساکت کر دیا' اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۲۔

مامون نے تمام اضلاع میں مناظرہ کی مجلسیں قائم کیں۔ ار ہر مذہب وملت کے آدمیوں کو بحث ومناظرہ کی اجازت دی۔ ان مجالس میں ہر جگہ معتزلی ہی ممتاز نظر آتے تھے اور درحقیقت اس وقت ان کی وجہ سے اسلام بڑے صدمہ سے محفوظ رہ گای۔ ابوالہذیل علاف کی خوبیٔ تقریر اور زور کلام کی وجہ سے تین ہزار سے زیادہ آدمی ایمان لائے۔ ابوالہذل و نظام نے مظہب اعتزال میں چند نئے اصول اضافہ کیے جن کی تفصیل آگے آئے گی۔

مامون کے بعد معتصم اور معتصم کے بعد واثق تخت پر بیٹھا۔ یہ دونوں معتزلی تھے۔ اور ان کی وجہ ے اعتزال کو زیادہ قوت حاصل ہو گئی تھی۔ معتصم اور واثق کے دربار میں قاجی احمد بن ابی داؤد جو قاضی القضاۃ تھے تمام سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ یعنی ملک کا کوئی انتظام ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہوسکتا تھا۔ قاضی صاحب معتزلی تھے۔ اور صرف ایک واسطے سے

واصل بن عطا کی شاگردی کا شرف رکھتے تھے۔ان کے زمانہ میں اعتزال کو وہ زور حاصل ہوا کہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔واثق کے بعد اگرچہ متوکل نے تعصب مذہبی کی وجہسے ہر قسم کی عقلی ترقی روک دی۔لیکن تمام اسلامی ممالک میں یہ مذہب جڑ پکڑ چکا تھا۔اور متوکل کے مٹانے سے مٹ نہ سکتا تھا چنانچہ چوتھی صدی تک اعتزال کو پوری قوت حاصل رہی اور بڑے بڑے متکلم مفسر، ادیب پیدا ہئے جن کی تصنیفات اب تک بڑے پایہ کی خیال کی جاتی ہیں۔سب سے اخیر ابوعلی جبائی تھا جس نے سنہ ۳۰۳ھ میں وفات پائی اور جس کے بعد اس درجہ کا کوئی امام الاعتزال نہیں پیدا ہوا۔

۱۔ کتاب الفہرست ابن الندیم ۲۔ الملل والنحل لاحمد بن مرتضیٰ ذکر مامون

اسلامی ممالک میں اسپین میں فلسفہ اور عقلیات کو عوام نہایت ناپسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص فلسفہ کے مام سے منسوب ہوتا تھا تو بازار میں اس کا نکلنا مشکل ہو جاتا تھا حکیم ابن رشد اسی جرم مُں جلاوطن کیا گیا۔

شام میں بھی فلسفہ وعقلیات کو کبھی ترقی نہیں ہوئی۔اس لحاظ سے ان دونوں ملکوں میں اعتزال کا رواج نہ پانا تعجب نہیں ہندوستان کا بھی تقریباً یہی حال ہے کئی سو برس تک یہاں عقلی علوم کا قدم نہیں آیا۔تیموریوں کے زمانہ سے منطق وفلسفہ کی بنیاد پڑی۔لیکن اس وقت مذہب اعتزال خود ناپید اہو چکا تھا جس کی وجہ آگے آئے گی۔

چوتھی صدی کے آغاز میں ابوالحسن اشعری کا نشو ونما ہوا۔ یہ ابوعلی جبائی کے شاگرد تھے اور مدت تک معتزلی رہے۔ایک دن ایک مسئلہ میں جو اعتزال سے تعلق رکھتا تھا انہوں نے جبائی کو بند کر دیا اور پھر اعتزال سے توبہ کر کے سنی اور شافعی ہو گئے۔فقہا اور محدثین جو

فلسفہ اور منطق سے بالکل نا آشنا تھے اور اس وجہ سے معتزلیوں سے ہمیشہ جھکتے تھے ان کو ابوالحسن اشعری نے نہایت غنیمت معلوم ہوئے۔ انہوں نے ان کو نہایت تپاک سے لیا۔ اور انکی تصنیفات میں جا بجا قرآن و حدیث کے حوالے تھے اس لیے عام لوگوں میں ان کا بہت رواج ہو گیا اور معتزلہ کا زور کم زور ہونا شروع ہوا۔ تاہم چوتھی صدی کے اخیر تک کوئی صوبہ بلکہ ضلع اور پرگنہ و شہر معتزلہ کے وجود سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ علامہ بشاری نے جس نے چوتھی صدی میں دنیا کا سفر کیا' مقامات ذیل کے متعلق معتزلہ کی نسبت یہ تفصیل لکھی ہے۔

عرب: سردات اور حرمین کے سواحل اور خصوصاً اعمان کے تمام باشندے معتزلی۔

عراق: معتزلہ یہاں بھی ہیں لیکن حنبلیوں اور شیعوں کا غلبہ ہے۔

اقور: موضع عانتہ میں کثرت سے معتزلی ہیں

مصر: فسطاط میں معتزلہ کا بڑا زور ہے۔

خراسان: دیہات میں زعفرانیہ بہت ہیں۔ (زعفرانیہ درحقیقت اعتزال کی ایک شاخ ہے)۔

فارس: معتزلہ اور شیعہ کثرت سے ہیں

کرمان: سیرجان میں اکثر معتزلہ ہیں

خزرستان: اس ملک میں تمام دنیا کی بہ نسبت معتزلی زیادہ ہیں۔

امام ابوالحسن اشعری نے سنہ ۳۲۰ھ میں ان کے مذہب نے عراق میں ترقی کرنی شروع کی۔ ا۔ پانچویں صدی میں چند بڑے بڑے نامور علما مثلاً قاضی ابوبکر باقلانی ابن فورک' ابواسحاق' سفرائی' ابواسحاق شیرازی' امام غزالی نے اس مذہب کی تائید اور نصرت میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ اور معتزلہ کی تکفیر اور تفسیق کی۔ چونکہ اس وقت عباسیوں کی سلطنت برائے نام رہ گی تھی اور سلجوقیہ وغیرہ کی وجہ سے مذہبی آزادی بالکل باقی نہیں رہی تھی

اشعری مذہب کے رواج کے ساتھ اعتزال کے جبرا مٹانے کی کوشش کی گئی معتزلیوں پر ہر رح کا ظلم کیا جاتا تھا۔ اوران کو اپنے خیالات کے اظہار کی جرات نہیں ہوسکتی تھی محمد بن احمد جو بہت بڑے معتزلی عالم گزرے ہیں اور سنہ ۴۷۸ھ میں انتقال کیا پچاس برس تک اپنے گھر سے باہر نہیں نکل سکے علامہ زمخشری جن کی تفسیر کشاف گھر گھر میں پھیلی ہوئی ہے چونکہ معتزلی تھے اپنے ملک مُس چین سے رہنے نہیں پاتے تھے مجبوراً مکہ چلے گئے چنانچہ اپنی ہی تفسیر میں ایک موقع پر اس کا اشارۃ ذکر کیا ہے۔

امام غزالی جس زمانہ میں بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں مدرس تھے محمد بن تومرت مراکش سے آکر ان کا شاگرد ہوا اور ان سے اشعری عقائد سیکھے۔ بغداد سے واپس جا کر اس نے

ا۔ مقریزی ج ۲ ص ۳۵۸

سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کی وفات کے بعد عبدالمومن بن علی جو اس کا جانشین ہوا تمام مغرب واندلس کا بادشاہ بن گیا۔ محمد بن تومرت نے اشعری کے عقائد عبدالمومن کو حوالہ کر دیے تھے۔ اس نے اپنی تمام سلطنت میں ان کو رواج دیا اور حکم دے دیا کہ ان عقیدوں کو جا منکر ہو وہ قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ سخت خونریزی کے بعد تمام اسپین اور مغرب میں اشعری کے سوا اور کسی فرقہ کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔

سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس نے بچپن میں شاہ قطب الدین مسعود نیشاپوری سے تعلیم پائی تھی اور وہ اشعری المذہب تھے۔ سلطان صلاح الدین کو جب حکومت حاصل ہوئی تو اس نے تمام حکومت میں بجز اشعری عقائد جاری کر دیے۔۲۔

ساتویں صدی میں مغلوں اور ترکوں نے بغداد اور بغداد کے ساتھ بڑے بڑے شہروں بلکہ مسلمانوں کے تمام عقلی اور دماغی قوی کا استیصال کر دیا مدت تک تو یہ تمام ممالک ویران پڑے رہے۔ ترکوں کے مسلمان ہو جانے کے بعد دوبارہ نشو ونما شروع ہوا۔ لیکن وہ عقلی ترقیاں پھر عود نہیں کر سکتی تھیں۔ ترک قلم کی بہ نسبت تلوار سے زیادہ کام لیتے تھے۔ اور چونکہ چھٹی صدی کے بعد تمام اسلامی دنیا یعنی ہندخراسان' فارس' عراق' مصر' شام' ایشیائے کوچک' قسطنطنیہ وغیرہ میں ہر جگہ ترک ہی ترک تھے اس لیے وہ نازک اور دقیق مذہب جو تلوار کی بہ نسبت قلم سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا دوبارہ زندہ نہ ہو سکا۔ مذہب اعتزال کی ابتدا ترقی اور تنزل ایہ نہایت اجمالی خاکہ ہے۔ دوسرے آرٹیکل میں ہم ان کے فرقوں کی تفصیل اور ہر ایک کے عقیدے اور عقائد پر ریویو لکھیں گے۔ تیسرے آرٹیکل میں مشہور علمائے اعتزال کے مختصر حالات ہوں گے۔

(مقالات شبلی۔ مطبوعہ لکھنو)

ا۔ مقریزی ص ۳۵۸۔ ۲۔ مقریزی ص ۳۵۰

☆☆☆

ابن رشد

ابوالولید کنیت' حفید لقب' محمد بن احمد بن محمد بن رشد نام ہے۔ اس کا خاندان اندلس میں نہایت معزز خاندان میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا دادا محمد بن رشد سنہ ۴۵۰ھ مطابق سنہ ۱۰۵۸ء میں پیدا ہوا۔ علم فقہ میں اس درجہ کمال حاصل کیا کہ قرطبہ (کارڈوا) میں قاضی القضاۃ مقرر رہوا۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس فقہی مسائل کے حل کرنے کے لیے

ا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابن رشد کے حالات اسلامی تاریخوں اور تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں ابن ابی اصیبعہ نے مختصر طور پر اس کا تذکرہ کیا ہے۔ نفح الطیب میں بھی اس سے زیادہ مختصر ہے۔ ابن الآبار اندلسی نے بھی اجمال سے کام لیا ہے یہ تمام کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں' انصاری اور ذہبی کی کتابیں ہم نے نہیں دیکھیں لیکن ان کی عبارتیں معلم رینان نے بعینہ نقل کی ہیں ان میں بھی ایسی تفصیل نہیں جو ابن رشد کے شایان تھی۔ حال میں معلم رینان نے جو فرانس کا نہایت مشہور مصنف گزرا ہے' خاص ابن رشد کے حالات میں ایک ضخیم کتاب فرنچ زبان میں لکھی جس میں ابن رشد کی سوانح عمری تفصیل سے لکھی۔ رینان کو بڑا موقع یہ حاصل تھا کہ ابن رشد کے یہودی شاگردوں نے جو کچھ ابن رشد کے متعلق لکھا تھا وہ اس کے پیش نظر تھا۔ رینان نے ابن رشد کے فلسفہ پر بھی نہایت تفصیل سے بحث کی ہے جس کی وجہ سے کتاب کی ضخامت پر چار سو صفحوں سے متجاوز ہو گئی ہے۔ بیروت کے ایک عیسائی مورخ نے اپنی کتاب آثار الادبار میں اس کی مدد سے ابن رشد اکسی قدر مفصل

تذ کرہ لکھا ہے۔ پروفیسر انطون نے ابن رشد کے حالات میں ایک مستقل کتاب عربی زبان میں لکھی جو حال میں اسکندریہ سے شائع ہوئی ہے۔ لیکن اس کی اصلی غرض ایک مسلمان عالم (شیخ محمد عبدہ) سے مجادلہ کرنا تھا۔ چنانچہ اصلی مقصد کو چھوڑ کر ساری کتاب مجادلہ اور مشاتمہ سے بھر دی ہے۔ اردو زبان مُں بھی ابن رشد کے متعلق دو ایک مضمون لکھے گئے جن میں سینواب عماد الملک کا مضمون گو مختصر ہے لیکن چونکہ رینان سے ماخوذ ہے قابل استناد ہے۔

آتے تھے۔ ابن فران نے جو قرطبہ کی مسجد کا جامع امام تھا۔ اس کے فتاویٰ کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا ایک نسخہ اسپین کی ایک خانقاہ سان فیکتور میں تھا اور اب پیرس کے کتب خانہ میں ہے۔ شاہی دربار میں اس کو بڑا تقرب حاصل تھا۔ اور اکثر وہ ملکی معاملات میں دخیل ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کا حریف مقابل الفونس تھا جو اکثر اندلس پر حملہ آور ہوا کرتا تھا اور چونہ خود اندلس کے عیسائی اس کی اعانت کرتے تھے اکثر کامیاب ہوتا تھا۔ محمد بن رشد نے خاص اس غرض سے سنہ ۱۱۲۶ء میں مراکش (مراکو) کا سفر کیا اور سلطان مراکش سے درخواست کی کہ عیسائیوں کو اندلس سے جلاوطن کر کے افریقہ میں آباد کرایا جائے۔ سلطان نے اس صلاح کو نہایت پسند کیا۔ اور اس کے حکم سے ہزاروں عیسائی اندلس سے نکل کر طرابلس غرب میں جا کر آباد ہوئے محمد بن رشد نے سنہ ۵۳۰ھ مطابق سنہ ۱۱۶۲ء میں وفات پائی۔

محمد بن رشد کے فرزند احمد نے جو سنہ ۱۰۹۴ء میں پیدا ہوا تھا اپنی ذات قابلیت سے اپنے باپ کی جگہ حاصل کی یعنی قرطبہ کا قاضی مقرر ہوا۔ سنہ ۱۱۶۸ء میں وفات پائی۔ اور اپنی یادگار میں ایک ایسا نامور فرزند چھوڑا جس کی تصنیفات آج اسلام کی سب سے بڑی علمی یادگار ہیں۔

ابن رشد سنہ ۵۲۰ھ مطابق سنہ ۱۱۲۶ء میں اپنے دادا کی وفات سے ایک مہینہ پہلے بمقام قرطبہ میں پیدا ہوا علم چونکہ خاندانی تھا۔ اس لیے خود اپنے والد سے علوم کی تحصیل شروع کی موطا جو حدیث کی مشہور کتاب ہے اس کا راوی اول یحیٰی صمودی اسپین کا ہی رہنے والا تھا اور اس جہ سے اس کو موطا کو ان ممالک میں اس درجہ قبول حاصل تھا کہ قرآن کے بعد شمار کی جاتی تھی۔ ابن رشد کی تعلیم اول اسی سے شروع ہوئی۔ وہ موطا کو زبانی یاد کرتا تھا اور اپنے باپ کو سناتا تھا۔

حافظ ابوالقاسم بن بشکوال، ابومروان بن مسرہ، ابوبکر بن سمحون، ابوجعفر بن عبدالعزیز اور ابوعبداللہ مازری سے بھی حدیث کی تحصیل کی۔ علم فقہ حافظ ابومحمد بن رزق سے حاصل کیا۔ ادب اور عربیت اندلس کے نصاب تعلیم کا لازمی جزو تھا۔ اس لیے نہایت محنت اور شوق سے اس کی تحصیل کی۔ ابوالقاسم بن طلیسان کا بیان ہے کہ ابوتمام اور متنبّی کا دیوان اس کو زبانی یاد تھا اور اکثر صحبتوں میں ان کے اشعار وہ ضرب المثل کے طور پر برجستہ پڑھتا تھا۔

ان علوم کی تکمیل کے بعد اسنے طب کی طرف توجہ کی۔ اس زمانہ میں فن کا امام ابوجعفر ابن ہارون ترجالی تھا۔ وہ اشبیلیہ کا رہنے والا تھا اور وہاں کے اعیان میں گنا جاتا تھا۔ ابوبکر بن عربی جو امام غزالی کے شاگرد تھے۔ ان سے حدیث کی تحصیل کی تھی طب میں نہایت کمال حاصل کیا تھا ارسطو اور دیگر حکمائے متقدمین کی تصنیفات کا بڑا ماہر تھا۔ علوم نظریہ کے ساتھ معالجہ میں بھی کمال رکھتا تھا اور اس تعلق سے سلطان وقت یعنی یوسف بن عبدالعزیز کے دربار کا ملازم تھا۔

ابن رشد نے ابوجعفر کی خدمت میں ایک مدت تک طب کی تحصیل کی طب کے سوا اور علوم بھی اس سے حاصل کیے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اسپین کی علمی حالت اور ابن رشد کی فلسفیانہ تعلیم

عرب مورخ متفق اللفظ ہیں کہ اندلس میں فلسفہ کا پڑھنا پڑھانا عام طور پر ناممکن تھ۔ا۔ اگر یہ صحیح ہے تو ابن رشد' ابن طفیل' ابن باجہ جیسے حکماء کا اس ملک میں پیدا ہونا اسباب تاریخی کے خلاف ہے۔ اس لیے پہلے ہم اس عقدہ کو حل کرنا چاہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسپین میں مسلمانوں کی علمی زندگی ممالک مشرقیہ کی نسبت بالکل جداگانہ حالت رکھتی ہے۔ ممالک مشرقیہ میں علم وفن کی ابتدا دولت عباسیہ سے ہوئی جس کا صدر مقام بغداد تھا۔ عباسی حکومت کا مایہ خمیر پارسی اور عیسائی قومیں تھیں اور اس وقت تک ان کا ہر قسم کا لٹریچر زندہ موجود تھا ان کی آمیزش سے اسلامی علوم وفنون میں ابتدا ہی سے فلسفہ کا رنگ آ گیا تھا اور گو ایک مدت تک فقہا ومحدثین بہت کچھ دامن بچاتے رہے لیکن آخر مذہب وفلسفہ اس طرح سیر وشکر بن گئے کہ آج عقائد کو فلسفہ سے جدا کرنا' ناخن کو گوشت سے جدا کرنا ہے۔ لیکن اسپین کی حالت اس کے بالکل برخلاف تھی اسپین میں اسلامی حکومت کی ترکیب بالکل خاص اور بے میل تھی یعنی عرب کے سوا کسی دوسری قوم کا شائبہ نہ تھا عرب کے قبائل اس کثرت سے وہاں جا کر آباد ہو گئے تھے کہ اسپین حجاز ونجد کا ایک ٹکڑا بن گیا تھا مفتوحہ قوموں کا کوئی علمی لٹریچر موجود نہ تھا' اور تھا تو اس قدر کمزور حالت مُں تھا کہ فاتح لٹریزر پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتا تھا۔ مذاہب میں سے جس مزہب کا یہاں راج ہوا وہ مالکی مذہب ھتا۔ جو عرب کے دل و دماغ کا آئینہ تھا۔ ان اسباب سے ملک کی آب وہوا میں عربیت' عربیت میں مذہب اور مذہب میں تصلب اور تقشّف کا اثر آ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کسی کو فلسفہ ومنطق میں مشغول دیکھتے تھے تو زندیق کا خطاب دیتے تھے۔ اور اگر اس کی زبان سے کوئی آزادانہ فقرہ نکل جاتا تھا تو بغیر اس کے کہ حکومت سے چارہ کار کے

مستدعی ہوں خود اس کی زندگی کا فیصلہ کر دیتے تھے۔علامہ مقری نفح الطیب میں لکھتے ہیں۔

کلما قیل فلان یقرء الفلسفة اطلقت علیه العامه اسم زندیق فان زل فی شبهة رجموه بالحجارة و حرقوه قبل ان یصل امره الی السلطان

''جب یہ کہا جاتا تھا کہ فلاں شخص فلسفہ پڑھتا ہے تو عوام اس کو زندیق کہنے لگتے تھے اور اگر اس نے کسی شبہ میں لغزش کھائی تو قبل اس کے کہ بادشاہ کو اس کی خبر پہنچے اس کو پتھر مارتے تھے یا آگ میں جلا دیتے تھے''۔

بایں ہمہ چونکہ مشرقی ممالک سے علمی تعلقات قائم تھے۔یعنی تحصیل علوم کے لیے اسپین سیلوگ مشرق کو آتے جاتے رہتے تھے۔اور یہاں کے اہل کمال قدردانی کی امید پر مغرب کا سفر کیا کرتے تھے۔اسپین اور مراکش میں بھی کبھی کبھی فلسفہ کا جلوہ نظر آجاتا تھا۔ سب سے پہلے ان اطراف میں اس فتنہ کا پتہ تیسری صدی ہجری سےچلتا ہے اسحاق بن عمران بغداد کا ایک مشہور طبیب تھا۔وہ زیادۃ اللہ بن تغلب کے زمانہ میں افریقہ گیا اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔علامہ ابن ابی اصیبعہ اس کے حال میں لکھتے ہیں کہ یہ پہلا شخص ہے جس کی بدولت بلاد مغرب میں لوگوں نے فلسفہ کو جانا' اسحاق کے شاگرد ابن سلیمان نے ان فنون میں زیادہ کمال حاصل کیا۔اور الہیات میں ایک کتاب لکھی جس کا نام بستان الحکمۃ تھا۔ منطق میں بھی اس کی ایک تصنیف مدخل کے نام سے موجود ہے

لیکن ابھی تک یہ فتنہ باہر ہی باہر تھا یعنی خاص اسپین کی حدود اس آشوب سے پاک تھی۔یہاں تک کہ خلیفہ الحکم المستنصر لدین اللہ کا زمانہ آیا جس نے اندلس کو تمام دنیا کے علوم وفنون سے معمور کر دیا۔وہ سنہ ۳۵۰ھ میں تخت نشین ہوا۔اور اس اہتمام سے علوم وفنون کی تربیت پر توجہ کی کہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کا نام بھی ماند پڑ گیا۔بلاد مشرق میں ہر

ہر جگہ سفیر اور وکیل مقرر کیے کہ جس قدر نایات کتابیں جہاں سیمل سکیں کتب کانہ شاہی کو روانہ کی جائیں۔ دولت عباسیہ کا ہنوز علمی شباب تھا تاہم خلیفہ حکم کی رقیبانہ حوصلہ مندیوں کا مقابلہ نہ ہوسکا۔ اس کی یہ خاص کوشش تھی کہ جو نادر تصنیف ممالک مشرقیہ میں لکھی جائے بغداد سے پہلے اسپین پہنچ جائے۔ چنانچہ جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ علامہ ابوالفرج اصفہانی کتاب الاغانی لکھ رہا ہے تو حکم کے قاصدوں نے کتاب کے تمام ہونے سے پہلے ایک ہزار اشرفیاں مصنف کی خدمت میں پیش کیں کہ کتاب کا پہلا نسخہ جو تیار ہو وہ کتب شاہی کے لیے محفوظ رکھا جائے۔ اسپین کا خراج اس زمانہ میں پانچ کروڑ سے زائد تھا باوجود اس کے حکم کے علمی شوق کے لیے کافی نہ تھا۔ صاحب نفح الطیب لکھتے ہیں:

کان یستجلب المصنفات من الاقالیم و النواحی حتی ضاقت عنھا خزانیہ

"وہ تمام ممالک اور اطراف سے کتابیں بہم پہنچاتا تھا یہاں
تک کہ خزانہ شاہی ان مصارف کی برداشت نہ کرسکا"۔

حکم نے جو کتب خانہ جمع کیا تھا اس کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ صرف عربی دیوانوں کی تعداد اس قدر تھی کہ فہرست کے ۸۰ صفحے ان کے ناموں کے نذر ہوئے۔ کل کتابوں کی مجموعی تعداد علامہ مقری نے چار لاکھ بیان کی ہے۔ اس تعداد کی وقعت اس وقت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ جب یہ خیال کیا جائے کہ یہ مجموعہ ہر قسم کے رطب و یابس کا انبار نہ تھا بلکہ زیادہ تر منتخب اور نادرہ روزگار کتابیں تھیں کیونہ حکم خود نہایت بڑا مبصر اور ناقد تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ شاذونادر ہی کوئی کتاب تھی جو حکم کے مطالعہ میں نہ آئی ہو یا جس پر حکم نے مصنف کتاب کا نسب اور سال وفات نہ لکھا ہو۔ اس کے علاوہ اکثر کتابوں پر اس کے لکھے ہوئے ایسے مفید اور نادر علمی فوائد ہوتے تھے جو حکم کے سوا اور کسی کے قلم سے نہ نکل سکتے

تھے۔ا۔

اس کتب خانہ میں فلسفہ کی اکثر تصنیفات ممالک مشرقیہ سے منگوا کر جمع کر لی گئی تھیں۔اور یہ کتابیں فلسفہ کی ترویج کا بڑا سبب ہوئیں۔۲۔

حکم کے بعد اس کا جانشین ہشام اگرچہ فلسفہ کا دشمن نکلا اور اس کے بعد ایک مدت تک کسی نے فلسفہ کی سرپرستی نہ کی۔لیکن حکم نے فلسفہ دانوں کا ایک ایسا گروہ پیا کر دیا تھا کہ جس کا سلسلہ اخیر زمانہ تک برابر قائم رہا۔احمد اور عمر دو حقیق بھائی سنہ ۳۳۰ھ میں تحصیل علم کے لیے بغداد گئے اور سنہ ۳۵۱ھ مُس یعنی حکم کی تخت نشینی کے ایک برس بعد وہاں سے واپس آئے۔حکم نے دونوں کو اپنے خاص درباروں میں طلب کیا۔ایک اور مشہور

ا۔ حالات نفح الطیب اور پروفیسر رینان کی کتاب سوانح عمری ابن رشد میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ ۲۔ ابن ابی اصیبعہ ترجمہ ابوعبداللہ الکتانی

فاضل محمد بن عبدون الجبلی نے بھی اس غرض سے سنہ ۳۴۷ میں ممال مشرقیہ کا سفر کیا سلیمان محمد بن ظاہر بن بہرام سیسانی سے جو اس زمانہ کا سب سے بڑا منطق دان تھا منطق کی تحصیل کی۔وہ سنہ ۳۶۱ھ میں اندلس کو واپس آیا اور حکم نے اس کو طباعت کی خدمت دی۔

حکم کے دربار میں اور بہت سے فلسفہ داں تھے جن میں احمد بن حکم بن حفصون اور ابوبکر احمد بن جابر خاص شہرت رکھتے تھے۔ان لوگوں نے خود اور واسطہ در واسطہ ان کے شاگردوں نے فلسفہ دانوں کا ایک مستقل خاندان قام کر دیا۔یہاں تک کہ عبداللہ بن الکتانی نے سنہ ۴۲۰ھ میں انتقال کیا۔اس نے جب منطق کی تکمیل کرنی چاہی تو محمد بن عبدون جبلی کے علاوہ فلسفہ دانوں کی ایک جماعت کثیر مثلاً عمر بن یونس' احمد بن حکم' ابوعبداللہ بن محمد ابراہیم

القاضی' ابوعبداللہ بن محمد بن مسعود' محمد بن میمون' القاسم فید بن نجم' سعید بن فتمون' ابوالحارث اسقف' ابومرین بجائی موجود تھے اور ابوعبداللہ نے ان سب کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔

ایک خاص واقعہ جو اس سلسلہ مُں لحاظ کے قابل ہے یہ ہے کہ حکم نے مسلمانوں کے ساتھ یہود و نصاریٰ کی بھی سرپرستی کی۔ اس نے اکثر علمائے یہود و نصاریٰ کو دربار میں جگہ دی اور ان کو اس رتبہ تک پہنچایا کہ وہ اپنے مذہبی علوم میں بغداد ک دست نگر نہ رہے۔

ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ حکم کے زمانہ میں اسپین کے یہودی اپنے مذہبی رسوم اور مسائل فقیہ میں بغداد کے یہود کے محتاج تھے۔ اور وہیں سے فتویٰ منگواتے تھے لیکن جب خلیفہ حکم نے حسدامی بن اسحاق کو جو ایک نامور یہودی عالم تھا' دربار میں داخل یا اور دولت و مال سے مالا مال کر دیا۔ تو اس سے مشرقی مما لک سے زرخطیر صرف کر کے تمام مذہبی تاریخیں منگوائیں اور اس وقت اسپین کے یہود بغداد سے بے نیاز ہو گئے۔ ا۔

ا۔ طبقات الاطباء ترجمہ حسدامی بن اسحٰق

حکم کے طرز عمل نے تعلیم کے دائرہ کو نہایت وسیع کر دیا۔ یعنی مسلمان' یہود نصاریٰ سب ایں فلسفہ و معقولات کی تعلیم پھیل گئی۔ ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان فرقوں میں باہم علمی تعلقات قائم ہو گئے۔ یہود و نصاریٰ پہلے بھی مسلمانوں کی شاگردی سے عار نہ رکھتے تھے لیکن اب مسلمانوں کو بھی غیر مذہب والوں کی شاگردی سے عار نہ رہا۔

بہت سے نامور علمائے اسلام کے حالات مُں تم پڑھو گے کہ وہ طب اور فلسفہ میں عیسائی علماء کے شاگرد تھے۔ ان باتوں سے وسعت علمی کے علاوہ بڑا فائدہ یہ ہوا کہ فلسفہ کو ایک محفوظ جائے پناہ مل گئی۔ کیونکہ فلسفہ کی تعلیم و تعلم پر جو برہمی ظاہر ہوتی تھی وہ مسلمانوں

تک محدود تھی عیسائیوں اور یہودیوں سے کوئی تعرض نہ کرسکتا تھا' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکم کے بعد جب فلسفہ کا کوئی سرپرست نہ رہا اور فلسفہ کی آزادانہ تعلیم بند ہوگئی تو اس کا اثر یہود اور نصاریٰ پر نہ پڑ سکا۔ اور او وہ بدستور فلسفہ کی تعلیم و تعلم میں مصروف رہے۔ کیونکہ غیر مذہب والوں کو اسلامی حکومتوں میں ہمیشہ ہر قسم کی آزادی حاصل رہی' اس لیے وہ جو کچھ چاہتے تھے پڑھتے پڑھاتے تھے ان میں سے کوئی تعرض نہیں کرسکتا تھا۔

حکم کے بعد کئی صدیوں تک فلسفہ شاہانہ عنایت سے محروم رہا۔ یہاں تک کہ موحدین کی سلطنت قائم ہوئی یہ سلطنت محمد بن تومرت نے قائم کی تھی جو امام غزالی کا شاگرد تھا اور بڑا عالم تھا۔ اس وقت تک سپین کا شاہی مذہب فقہ میں مالکی' اور عقائد میں حنبلی یا مجسمی تھا۔ موحدین کی سلطنت جب قائم ہوئی تو چونکہ بانی سلطنت اشعری تھا سلطنت کا مذہب بھی اشعری قرار دیا گیا۔ اشعری مذہب میں امام غزالی کی وجہ سے معقولات کا کسی قدر رنگ آگیا تھا۔ اس لیے فلسفہ کے ساتھ وہ تعصب نہ رہا۔ عبدالمومن نے جو اس سلسلہ کا سب سے پہلا بادشاہ تھا۔ علوم وفنون پر شاہانہ حوصلہ سے توجہ کی اور عبدالملک بن زہر کو جو اس زمانہ کا بہت بڑا عالم تھا۔ اپنے خاص مقربین میں داخل کیا۔ عبدالمومن کے بعد اس کے جانشین یوسف بن عبدالمومن نے (۵۵۸ھ میں تخت نشین ہوا) حکم اور مامون الرشید کا زمانہ یاد دلایا۔ وہ خود بہت بڑا عالم تھا علوم عربیہ میں کوئی شخص اس کا ہمسر نہ تھا صحیح بخاری زبانی تھی فقہ میں بھی اچھی مہارت رکھتا تھا۔ ان علوم سے فارغ ہو کر اس نے فلسفہ پر توجہ کی۔ فلسفہ کی تصنیفات دور دور سے منگوائیں۔ اور ابن طفیل کو جو فلسفہ بوعلی سینا کا ہمسر تھا ندیم خاص مقرر کرکے اس خدمت پر مامور کیا کہ تمام اطراف و دیار میں علما اور اہل فن طلب کیے جائیں اور ان کو علمی خدمتیں دی جائیں۔ ابن طفیل نے جو آئمہ جمع کیے ان میں ایک ہمارا نامور ابن رشد بھی تھا۔ا۔

ان واقعات سے تم نے اندازہ کیا ہوگا کہ ابن رشد نے جس زمانہ میں نشو ونما پایا ملک میں فلسفیانہ مذاق کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس کے علاوہ اور متعدد اسباب تھے جن کی وجہ سے اس کو فلسفہ کی طرف رغبت ہوئی اس لیے جن اساتذہ سے فقہ اور طب کی تعلیم پائی تھی ان میں سے اکثر فلسفہ سے آشنا تھے ابوجعفر بن ہارون جس کی خدمت سے اس نے مدتوں استفادہ کیا۔علوم عقلیہ کا بہت بڑا ماہر تھا۔ابوبکر عربی جو علم فقہ میں اس کے استاد اور امام غزالی کے شاگرد تھے علم کلام کے تعلق کی وجہسے فلسفہ سے آشنا تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابن رشد کو ابتدائے تحصیل ہی میں فلسفہ کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ابن ابی اصیبعہ نے ابن باجہ کے حال میں لکھا ہے کہ ابن رشد نے اس کی شاگردی کی ہے۔ابن باجہ نے سنہ ۵۳۳ ھ میں وفات پائی ابن رشد ۵۲۰ ھ میں پیدا ہوا تھا۔اس بنا پر ابن باجہ کی وفات کے وقت ابن رشد کی عمر صرف ۱۳ برس کی تھی۔

ا۔ دیکھو ابن خلکان ذکر یوسف بن عبدالمومن

ابن رشد کے شیوخ فلسفہ میں سے ابن باجہ کے حالات خاص طور پر ذکر کرنے کے قابل نہیں کیونکہ اس سے ابن رشد کی علمی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ابن باجہ کا نام محمد بن یحیٰ بن باجہ ہے وہ سرقسطہ (سرگوشہ) میں پیدا ہوا اور یہیں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔آغاز شباب ہی میں اس کے فضل و کمال کی یہ شہرت ہوئی کہ ابوبکر بن ابراہیم صحراوی رئیس میں سرقسطہ نے اس کو اپنا وزیر مقرر کیا لیکن ابن باجہ کی شہرت جس قدر فلسفیانہ مذاق میں بڑھتی جاتی تھی اسی قدر عوام اس کی طرف سے بدظن ہوتے جاتے

تھے۔اس زمانہ میں امرائے بنو ہوداس وصف میں مشہور تھے۔ کہ وہ حکماء اور فلاسفہ کی قدر دانی کو عوام کی رضامندی پر مقدم رکھتے تھے۔ ابوبکر کو امرائے بنو ہود سے ہمسری کا دعویٰ تھا۔اس لیے اس نے بھی چندروز تک عوام کی پروانہ کی۔لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ اہل فوج تک برہم ہو گئے۔اور ایک جماعت کثیر ترک ملازمت کر کے چلی گئی۔مجبوراً ابن باجہ کو یہ دربار چھوڑنا پڑااور مراکش جا کر ملثمین کے درباد میں ملازمت اختیار کی یہاں اس کی بہت قدر ہوئی۔لیکن موت نے جلدی کی اور سنہ ۵۳۳ھ میں انتقال کر گیا۔آثارالادبار میں امیر رکن الدین بیرس کی کتاب زبدۃ الفکرۃ فی تاریخ الہجر ۃ سے نقل کیا ہے کہ لوگوں نے حسد سے اس کو زہر دے دیا۔ یہ روایت صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اس قدر مسلم ہے کہ عوام اس کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔علامہ ابن ابی اصیبعہ لکھتے ہیں کہ:

بلی مجن کثیرۃ وشناعات من العرام و قصد و اھلاکہ مرات

''اس کو بہت سی مصیبتیں پیش آئیں اورعوام اس کو برا بھلا کہتے تھے اور چند بار لوگوں نے اس کے مارڈالنے کا قصد کیا''۔

ابن باجہ کو علوم عقلیہ میں جو کمال حاصل تھا اس کے لحاظ سے وہ اندلس کا ارسطو کہا جا سکتا ہے۔ممالک مشرقیہ میں بھی فارابی اور یعقوب کندی کے سوا کوئی اس کا ہم پایہ نہیں پیدا ہوا۔علوم وفنون کو اس نے جو ترقی دی اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن اس کو اجمالاً ان عنوانوں میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ارسطو کی تصنیفات کی شرحیں لکھیں۔

۲۔ فلسفہ کی شاخوں پر مستقل کتابیں لکھیں جن میں اپنی ذاتی تحقیقات درج کیں (ان تصنیفات کا ذکر تفصیل کے ساتھ طبقات الاطباء میں موجود ہے)

۳۔ امام غزالی کے برخلاف یہ ثابت کیا کہ علوم نظریہ ادراک حقائق کے لیے کافی

ہیں علوم کشفیہ کی ضرورت نہیں۔

۴۔ موسیقی پر نہایت محققانہ کتاب لکھی اور بہت سے راگ خود ایجاد کیے۔

ابن باجہ نے جس کام کو شروع کیا۔ ابن رشد نے اس کو انجام تک پہنچایا اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ شاگرد نے استاد ہی کی رہنمائی سے اس پر خطر وادی میں قدم رکھا، اور یہ منزل طے کی۔

اس موقع پر یہ واقعہ افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ ابن باجہ کی تصنیفات سے اسلامی کتب خانے بالکل خالی ہیں۔ البتہ یورپ میں کچھ کچھ پتا چلتا ہے منطق میں اس نے جو رسالے لکھے تھے وا اسپین کے کتب خانہ اسکوریال میں محفوظ ہیں۔ ایک رسالہ جس کا نام الوداع ہے اس کا ترجمہ یہودیوں نے عبرانی زبان میں کیا ہے۔ فرانس کی لائبریری میں موجود ہے۔ حیواۃ المعتزل اس کی مشہور کتاب خود ناپید ہے لیکن موسیٰ یہودی نے شرح رسالہ حی ابن یقظان میں اس سے اکثر فوائد نقل کیے ہیں۔

۱۔ ابن باجہ کا حال ابی ابن اصیبعہ نے لکھا ہے لیکن نہایت مختصر ہے، آثار الادبار میں تفصیل کی ہے لیکن اس کا ماخذ مشرقی کتابیں نہیں بلکہ یورپ کی تصنیفات ہیں۔ نفح الطیب میں اس قدر لکھا ہے کہ فن موسیقی میں وہ ابونصر فارابی کا ہمسر ہے۔ اور اسپین میں جو راگ مشہور ہیں اسی کی ایجاد ہیں۔

عہد قضا اور دربار کے تعلقات

اوپر گزر چکا ہے کہ ابن رشد کا دادا قاضی القضاہ کے منصب پر ممتاز تھا۔ اس تعلق سے ابن رشد کو آغاز شباب ہی میں قضاء کی خدمت مل گئی۔ وہ پہلے اشبیلیہ کا قاضی مقرر ہوا پھر ابو محمد ابن مغیث قاضی قرطبہ کے مرنے پر قرطبہ (کارڈوا) کے قضا کے خدمت ملی۔ اس خدمت کو جس خوبی سے اس نے انجام دیا۔ اس کی شہرت نے اس کو دربار شاہی تک پہنچا دیا۔

یہ موحدین کی سلطنت کا زمانہ تھا اور اس سلسلہ کا پہلا فرمانروا عبدالمومن سریر آرائے سلطنت تھا [1]۔ عبدالمومن خود ایک فاضل شخص تھا۔ محمد بن تومرت کے فیض صحبت سے جو امام غزالی کا شاگرد تھا اس کا فضل و کمال اور زیادہ ترقی کر گیا۔ ابن رشد کی دیانت اور کمالات علمی کا حال جب اس کو معلوم ہوا تو دربار میں آ کر اپنے خاص ندیموں میں شامل کیا' اور قضا کی خدمت بھی بحال رہنے دی سنہ ۵۴۷ھ میں جبکہ اس کی عمر ۲۷ سال کی تھی وہ قاضی القضاۃ مقرر رہوا۔ یعنی اندلس سے لے کر مراد کو تک کے کل علاقے اس کی قضا کے حدود میں آ گئے۔ وہ ان تمام مقامات کا دورہ کرتا رہتا تھا۔ اور دیوانی عدالتوں کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ اپنی تصنیفات میں اکثر بقید سال و تاریخ ان واقعات کا ذکر کرتا تھا جو زمانہ تصنیف میں پیش آئے۔ ان واقعات کے ترتیب دینے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کس کس سنہ میں وہ کہاں کہاں تھا عبدالمومن نے ۵۵۶ھ میں قضا کی اور اس کا بیٹا محمد یوسف تخت نشین ہوا۔ یوسف بہت بڑا فاضل اور بلند حوصلہ بادشاہ تھا۔ عبدالمومن نے اس کی تربیت میں تیغ و قلم' دونوں کے اہل کمال کا اہتمام کیا تھا جو لوگ تیغ کے فن میں یکتائے زمانہ تھے اس کی تعلیم و تربیت پر مامور کیے [2]

---

[1] ابن خلکان کی روایت کے موافق عبدالمومن نے سنہ ۵۴۱ھ میں مراکش پر قبضہ کیا

اور سنہ ۵۴۴ھ میں ملثمین کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اس لیے عبدالمومن کی سلطنت کا آغاز سنہ ۵۴۲ھ سے سمجھنا چاہیے۔ ۱۲ ابن خلکان تذکرہ یوسف بن عبدالمومن

اسی کا اثر تھا کہ یوسف دونوں میدانوں میں اپنے حریفوں سے آگے نظر آتا تھا۔ اس زمانہ میں عیسائیوں نے ٹالیڈو (طیطلہ) کو دارالسلطنت قرار دے کر اسپین کے اکثر اضلاع مسلمانوں کے ہاتھ سے چھین لیے تھے۔ یوسف نے اپنے زور بازو پر اکثر اضلاع واس لیے۔ لیکن اس مضمون میں ان واقعات کی تفصیل کا موقع نہیں یہاں صرف اس کے علمی حالات بیان کیے جاسکتے ہیں۔

وہ اگرچہ علوم وفنون میں کمال رکھتا تھا لیکن فلسفہ اور عقلیات کی طرف خاص میلان تھا' اسی بنا پر اس نے ابن طفیل نے جو علوم عقلیہ میں ابن سینا کا ہم پایہ تھا' ندیم خاص اور صیغہ علمی کا افسر مقرر کیا۔ ابن طفیل نے اس کے حکم کے مطابق دور دور سے ہر فن کے حکماء اور فضلاء دربار میں طلب کیے۔ ان میں ایک ہمارا رہنما ابن رشد بھی تھا۔[۱]

ابن رشد جس کیفیت کے ساتھ دربار میں داخل ہوا ہے اس کی کیفیت اس نے خود بیان کی ہے وہ کہتا ہے کہ:[۲]

جب میں دربار میں داخل ہوا تو ابن طفیل بھی حاضر تھا۔ اس نے امیر المومنین یوسف کے حضور میں مجھ کو پیش کیا اور میرے خاندانی اعزاز اور میری ذاتی لیاقت کو نہایت آب و تاب سے بیان کیا۔ یوسف میری طرف مخاطب ہوا' پہلے میرا نام ونسب پوچھا' پھر کہا کہ حکماء عالم کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟ یعنی ان کے نزدیک عالم قدیم ہے یا حادث؟ یہ سوال سن کر میں ڈر گیا اور چاہا کہ بالطائف الحیل اس سوال کو ٹال جاؤں۔ چنانچہ میں نے کہا کہ میں فلسفہ سے واقف نہیں۔ یوسف مجھ کو بدحواس دیکھ کر ابن طفیل کی طرف متوجہ ہوا اور اس

مسئلہ پر بحث کرنی شروع کی ۔ارسطو اور افلاطون اور دیگر حکمانے جو کچھ اس مسئلہ کے متعلق لکھا ہے بہ تفصیل بیان کیا پھر متکلمین اسلام نے حکماء کی رائے پر جو اعتراضات کیے ہیں ایک ایک کر

ا۔ ابن خلکان تذکرہ یوسف بن عبدالمومن ۲۔ پروفیسر رینان کی کتاب تذکرہ ابن رشد

کے بیان کیے۔ یہ حالت دیکھ کر میرا خوف جاتا رہا لیکن مجھ کو تعجب ہوا کہ ایک بادشاہ علوم عقلیہ میں یہ دستگاہ رکھتا ہے جو طبقہ علما میں بھی شاذونادر ہی کسی کو حاصل ہوتی ہے۔تقریر سے فارغ ہو کر اس نے پھر میری طرف توجہ کی' اب میں نے آزادی کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کیے۔ جب دربار سے رخصت ہوا تو مجھ کو خلعت زرنقد اور سواری کا گھوڑا عنایت کیا''۔

فلسفہ کے سلسلہ میں ابن رشد کا جو بڑا کارنامہ ہے وہ تصنیفات ارسطو کی شرح ہے اس کارنامے کا اصلی باعث یوسف تھا خود ابن رشد کا بیان ہے کہ ایک دن ابن طفیل نے مجھ کو بلا بھیجا اور کہا کہ آج امیر المومنین (یوسف) اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ ارسطو کا فلسفہ نہایت دقیق ہے اور مترجموں نے ترجمہ اچھا نہیں کیا۔کاش کوئی قابل شخص اس کام پر آمادہ ہوتا اور فلسفہ ارسطو کو اس طرح آسان کر کے ادا کرتا کہ لوگ آسانی سے سمجھ سکتے یہ کہہ کر ابن طفیل نے ابن رشد سے کہا کہ میری تو اب عمر نہیں رہی۔اس کے علاوہ امیر المومنین کی خدمت سے فرصت نہیں ہوتی تم اس کو اٹھالو اور تم ہی اس کام کو سرانجام دے سکتے ہو۔ابن رشد کا بیان ہے کہ اسی دن سے میں نے اس کام کی ابتدا کی۔

یوسف نے سنہ ۵۸۰ھ میں وفات پائی اور اس کا بیٹا یعقوب منصور تخت نشین ہوا۔ وہ نہایت اولوالعزم بادشاہ تھا۔ موحدین کی سلطنت اس کے زمانہ میں انتہائے کمال کو پہنچ گئی اس کی وسعت فتوحات اور جاہ وجلال کی داستان گو نہایت دلچسپ ہے لیکن اس کا یہ محل نہیں علمی مرحلہ میں اس نے جو کام کیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ فقہاء کو حکم دیا کہ کسی مجتہد یا امام کی تقلید نہ کریں بلکہ خود اپنے اجتہاد سے کام لیں عدالتوں میں فقہ کی پابندی اٹھا دی چنانچہ جو فیصلہ کیا جاتا قرآن' حدیث' اجماع اور قیاس سے کیا جاتا تھا۔ ابن خلکان نے منصور کے حالات میں جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ میں مغرب سے جو علماء آئے مثلاً ابو الخطاب بن وحیہ' ابو عمرو' محی الدین عربی وغیرہ سب کا یہی طریقہ تھا یعنی کہ کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ نصور نے جیسا کہ اس کی علم پروری کے لحاظ سے توقع کی جا سکتی تھی ابن رشد کی نہایت قدردانی کی۔ سنہ ۵۹۱ھ میں جب وہ الفانس کے مقابلہ کے لیے جا رہا تھا۔ ابن رشد کو دواعی ملاقات کے لیے دربار میں طلب کیا۔ اور اس قدر تعظیم و تکریم کی کہ تمام دربار کو حیرت ہوئی۔ ارکان سلطنت میں سب سے زیادہ تقرب عبدالواحد کو حاصل تھا جو منصور کا داماد اور ندیم خاص تھا۔ دربار کی ترتیب میں اس کا تیسرا نمبر تھا لیکن ابن رشد اس سے بھی آگے بڑھا۔ یعنی منصور نے اس کو بلا کر خاص اپنے پہلو میں جگہ دی اور دیر تک باتیں کرتا رہا۔ ابن رشد جب دربار میں واپس آیا تو دوستوں نے بڑے بڑے جوش و خروش سے اکا مبارک باد دی۔ انجام میں حکیم نے بجائے اس کے کہ مسرت کا اظہار کرتا افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ ''یہ خوشی کا نہیں بلکہ رنج کا موقع ہے کیونکہ دفعتہً اس درجہ کا تقرب برے نتائج پیدا کرے گا'' اور افوس ایسا ہی ہوا۔

☆☆☆

ابن رشد کی تباہی

سلاطین اسلام میں منصور اور اس کا ہم عمر سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس اپنے زمانہ میں اسلام کے مایہ ناز تھے۔ اتفاق سے ان دونوں کو اہل کمال بھی ایسے ہاتھ آئے تھے جن پر آج تک اسلام کو ناز ہے۔ یعنی ابن رشد اور شیخ الاشراق لیکن زمانہ کی نیرنگیاں دیکھو وہی صلاح الدین جس کا دامن انصاف ہر قسم کے داغ سے پاک تھا شیخ الاشراق کا قاتل ہے۔ اور وہی منصور جو عدل و انصاف کا پیکر مجسم تھا ابن رشد کا بربادکنندہ ہے۔

ابن رشد کی تباہی و بربادی چونکہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے اسلیے مورخین نے اس کے اسباب کی تحقیق میں بہت جدوجہد کی ہے اور مختلف مورخوں نے مختلف اسباب بتائے ہیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ ابن رشد کی عادت تھی کہ جب دربار میں منصور سے کسی علمی مسئلہ کے متعلق بحث کرتا تھا تو منصور کو "برادر من" کہہ کر خطاب کرتا تھا اس سے بڑھ کر یہ کہ ارسطو کی کتاب "الحیوانات" کی جو شرح لکھی اس میں زرافہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ اس جانور کو بادشاہ (یعنی منصور) کے ہاں دیکھاہ۔ یہ معمولی طریقہ خطاب منصور کی گویا صریحی توہین تھی۔!

یہ روایت اس لیے قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ منصور بالطبع نہایت فخر پسند اور جاہ طلب تھا۔ یورپ نے بیت المقدس کو جب مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینا

۱۔ ابن ابی اصیبعہ تذکرہ ابن رشد

چاہا اور اس ارادہ سے یورپ کے ہر حصہ سے فوجوں کا بادل اٹھ کر بیت المقدس کی طرف بڑھا تو صلاح الدین نے منصور کے پاس قاصد بھیجا کہ یہ اسلام کی حمایت کا وقت ہے۔ منصور ہر طرح اعانت دینے کے قابل تھا' اور اعانت دینا چاہتا تھا لیکن اتنی سی بات پر برہم ہو گیا کہ صلاح الدین نے اسے اپنے خط میں اس کو امیر المومنین کے لقب سے مخاطب نہیں کیا تھا!

صلاح الدین کا تو صرف یہ قصور تھا کہ اس نے منسور کو تمام دنیا کا امیر المومنین نہیں مانا۔ ابن رشد نے یہ غضب کیا کہ منصور کو صرف بربر کے بادشاہ کے لقب سے یاد کیا اس سے بڑھ کر منصور کی کیا اہانت ہو سکتی تھی۔

اکثر مورخین کا بیان ہے کہ ابن رشد کی بربادی کا سبب منصور کا مذہبی تعصب تھا اور ظاہر حالات بھی اس کے مقتضی ہیں کیونکہ ابن رشد جو فرد قرار داد جرم لگائی گئی تھی وہ الحاد اور بے دینی کی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ موحدین کی سلطنت کی بنیاد مذلب کی سطح پر قائم ہوئی تھی اسلسلہ کا بانی محمد بن تومرت امامت اور مہیدویت کا مدعی تھا اور اسی حیثیت سے اس نے سلطنت کی بنیاد قائم کی تھی۔ سلطنت کا صدر مقام مراکش تھا جو صحرا نشین بدوؤں کا گویا کعبہ تھا۔ اور جہاں ہر طرف بدویت اور سادہ عربیت کے آثار نظر آتے تھے۔ فوجی اور ملکی ارکان ٹھیٹ مذہبی خیال کے لوگ تھے سلطنت کی ملکی قوت محض اس بات پر موقوف تھی کہ مذہبی جوش کا رنگ قائم رکھا جائے۔ عیسائیوں نے اسپین کے اکثر حصے دبا لیے تھے۔ ان کے مقابلے میں صرف مذہبی جوش کی قوت سے عہدہ برائی ہو سکتی تھی۔ اور منصور نے جو اس سلسلہ کا تیسرا

فوجدار تھا اسی قوت سے کام لے کر عیسائیوں پر عظیم الشان فتوحات

---

۱ ابن خلکان تذکرہ یعقوب منصور

حاصل کی تھیں ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ دربار فقہا اور محدثین کے ہاتھ میں تھا اور تمام ملک پر انہی کے خیالات چھا گئے تھے۔

ان واقعات کے ہوتے ہوئے ابن رشد نے فلسفہ پر توجہ کی اور اس طرح کہ ارسطو کو اپنا امام اور پیشوا قرار دیا۔ اس کی تمام خصوصیات کی تہذیب و ترتیب کی' ان پر شرحیں لگائیں اور بہت سے مسائل کی جو جمہور اسلام کے خلاف تھے حمایت کی۔ ان میں ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ افلاک قدیم اور ازلی ہیں خدا نے ان کو نہیں پیدا کیا۔ بلکہ خدا صرف ان کی حرکت کا خالق ہے۔ ابن رشد نے صرف یہی نہیں کیا ک فلسفہ میں تصنیفات و تالیفات کیں اور فلسفیان مسائل کی اشاعت کی بلکہ اکے ساتھ یہ بھی دعویٰ کیا کہ اسلامی عقائد کی صحیح تشریح وہی ہے جو ارسطو کے مسائل کے موافق ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ یہ کہ اشاعرہ کے عقائد کو نہایت زور و شور کے ساتھ باطل کیا اور ثابت کیا کہ یہ عقائد عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہیں۔ اس موقع پر یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ موحدین خود اشعری تھے اور انہوں نے اس مذہب کو شاہی مذہب قرار دیا تھا۔ ان سب پر یہ اضافہ ہوا کہ ابن رشد نے امام غزالی کی تہافتہ الفلاسفہ کا رد لکھا اور اس کتاب میں اکثر جگہ امام صاحب کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے۔ حالانکہ امام غزالی موحدین کے پیران پیر تھے کیونکہ وہ محمد تومرت کے استاد تھے۔ اور محمد بن تومرت موحدین کا امام تھا اور ان کی سلطنت کا بانی تھا۔

فلسفہ کا رنگ ابن رشد پر اس قدر غالب آ گیا کہ بعض اوقات بے اختیار اس کی زبان

سے ایسے الفاظ نکل جتے تھے جو عام عقائد کے خالف ہوتے تھے۔ انصاری نے ابو محمد عبدالکبیر سے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ منجموں نے یہ پیشن گوئی کی کہ اس سال نہایت سخت ہوا کا طوفان آئے گا جس سے ہزاروں آدمی ہلاک ہو جائیں گے۔ عوام پر اس پیشن گوئی کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے تہ خانے تیار کرائے ارو تمام ملک میں نہایت سخت پریشانی پھیل گئی یہاں تک کہ خود سلطنت کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اور دربار میں ایک بڑا مجمع ہوا اور تمام علماء اور فضلاء طلب کیے گئے۔ ان میں ابن رشد بھی تھا۔ دربار سے لوگ واپس آئے تو میں نے ابن رشد سے کہا کہ اگر یہ پیشن گوئی صحیح نکلی تو یہ دوسرا طوفان ہوگا کیونکہ قوم عاد کے بعد اس قسم کا طوفان نہیں سنا گیا۔ ابن رشد بے اختیار جھلا کر بولا کہ خدا کی قسم قوم عاد کا وجود ہی ثابت نہیں، طوفان کا کیا ذکر ہے۔ اس پر تمام لوگ حیرت زدہ ہو گئے۔

ابن رشد کی یہ تمام باتیں اگر اس کی ذات تک محدود رہتیں تو چنداں شورش نہ ہوتی لیکن وہ قاضی القضاۃ تھا فقیہ تھا طبیب تھا۔ اور یہ سب تعلقات اس قسم یک تھے کہ اس کے معتقدات اور خیالات تمام ملک میں پھیل جاتے تھے۔ ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ملک میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ابن رشد سے جن لوگوں کو حسد تھا ان کو اس سے بڑھ کر کیا موقع مل سکتا تھا۔ ان لوگوں نے اس آگ کو اور بھڑکایا نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر منصور علانیہ ابن رشد سے باز پرس نہیں کرتا تو رعایا اس کی طرف سے بدگمان ہو جاتی۔ غرض منصور نے حکم دیا کہ ابن رشد مع اپنے شاگردوں اور پیرووں کے مجمع عام میں حاضر کیا جائے۔ چنانچہ قرطبہ کی مسجد میں ایک عظیم الشان مجمع ہوا جس میں ابن رشد ایک مجرم کی حیثیت سے لایا گیا۔ اس مجمع میں تمام فقہا اور علماء شریک تھے۔ سب سے پہلے قاضی ابوعبداللہ ابن مروان نے تقریر کی اور کہا کہ ہر چیز میں نفع اور ضرر دونوں باتیں پائی جاتی ہیں اس بنا پر نافع اور مضر ہونے کا فیصلہ نفع اور ضرر کے غلطہ کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر اس چیز میں نفع کی مقدار زیادہ

ہے تو نافع ہے اور کم ہے تو مضر ہے۔ قاضی ابوعبداللہ کے بعد ابوعلی بن حجاج نے جو خطیب تھے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ ابن رشد ملحد اور بے دین ہو گیا ہے۔

یہ سب ہوا لیکن اسلامی آزادی اور فراخ حوصلگی کا پھر بھی اتنا اثر تھا کہ یورپ کی مجلس انکویزیشن کی طرح یہ فتویٰ نہیں دیا گیا کہ مجرم زندہ جلا دیا جائے بلکہ صرف اس سزا پر قناعت کی گئی کہ وہ کسی علیحدہ مقام پر بھیج دیا جائے۔ حاسدوں نے یہ بھی شہادت دی تھی کہ ابن رشد کے خاندان کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کیونکہ اسپین میں جو قبائل آباد ہیں ابن رشد کو کسی سے خاندان تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق اگر ثابت ہوتا ہے تو بنی اسرائیل کے خاندان سے ثابت ہوتا ہے۔ اس بنا پر یہ قرار پایا کہ وہ موضع لوسینا[1] بھیج دیا جائے کیونکہ یہ خالص بنو اسرائیل کی بستی تھی اور ان کے سوا اور کوئی قوم یہاں سکونت نہیں رکھتی تھی۔

چونکہ اصلی غرض عوام کو مطمئن کرنا تھا اس لیے منصور نے ایک فرمان لکھوا کر تمام ملک میں شائع کروا دیا جس میں اس واقع کا اجمالاً اور ملاحدہ کی دار و گیر کا تفصیلاً ذکر تھا۔

فرمان کی ابتدائی عبارت یہ تھی:

قد کان فی سالف الدھر قوم خاضوا نی جور الا وھام واقد لھم عوامجم بشفوف علیھم فی الافھام حیث لاداعی یدعوالی الحی القیوم ولا حاکم یفسل بین المشکوک فیہ والمعلوم فحلدوا فی العالم مخامالھا من خلاق مسودۃ المعانی والا و راق بعدھا من الشریعۃ بعد المشرقین وتباینھا بتائن الثقلین یوھمون ان العقد میزانھا والحق برھا نھا وھم

---

[1] یہ قرطبہ کے قریب ایک چھوٹی سی بستی تھی جہاں صرف یہودی سکونت رکھتے تھے

يتشعبون فی القضية الواحدة فرقا ويسيرون فيها شواكل وطرقا الخ

چونکہ فرمان کی عبارت فضول مکر وقوافی اور حشو و زد دید سے بھری ہوئی ہے اس لیے ہم نے اس کا لفظی ترجمہ نہیں کیا مضمون کا خلاصہ یہ ہے:

زمانہ قدیم میں کچھ لوگ ایسے تھے جو وہم کے پیرو تھے۔ تاہم عوام ان ک کمال عقلی کے گرویدہ ہو گئے۔ ان لوگوں نے اپنے خیال کے مطابق کتابیں تصنیف کیں جو شریعت سے اس قدر دور تھیں کہ جس قدر مشرق سے مغرب دور ہے۔ ہمارے زمانہ میں بعض لوگوں نے ان ہی ملاحدہ کی پیروی کی اور انہی کے مذاق پر کتابیں لکھیں۔

یہ کتابیں بظاہر قرآن مجید کی آیتوں سے آراستہ ہیں لیکن تہ میں الحاد اور زندقہ ہے۔ جب ہم کو ان حالات کی خبر ہوئی تو ہم نے ان کو دربار سے نکال دیا اور حکم دیا کہ ان کی تصنیفات جہاں ہاتھ آئیں جلادی جائیں۔

عوام میں جو برہمی پھیل گئی تھی اس کے روکنے کے لیے یہ تدبیر بھی کافی تھی۔ منصور نے ایک خاص محکمہ اس غرض سے قائم کیا کہ فلسفہ وار منطق کی تصنیفات ہر جگہ سے مہیا کی جائیں اور جلا دی جائیں چنانچہ سینکڑوں کتابیں، ہزاروں کتابیں آگ کی نظر ہو گئیں۔ منصور نے یہ سب کچھ کیا لیکن وہ فلسفہ داں اور فلسفہ پرست تھا۔ اس لیے فلسفہ کی یہ تباہی اور بربادی اس کو دل سے گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔ تدبیر یہ اختیار کی کہ اس محکمہ کا افسر حفید ابو برکر ان زہر کو مقرر کیا جو خود بہت بڑا فلسفہ داں تھا اور فلسفہ کا شیفتہ تھا۔ علامہ ابن ابی اصیبعہ نے ابوبکر بن زہر کے حال میں لکھا ہے کہ اس سے منصور نے عرض یہ تھی کہ ابوبکر ابن زہر کے پاس فلسفہ اور منطق کی جو کتابیں آئیں گی وہ برباد ہونے سے محفوظ رہ جائیں گی۔ ابن زہر نے تمام کتب فروشوں کے پاس حکم بھیج دیا کہ فلسفہ کی جس قدر کتابیں موجود ہوں فوراً یہاں بھیج دی جائیں اور جو لوگ فلسفہ کی تحصیل میں مصروف ہوں ان کو سزا دی جائے۔ ابن زہر کا حکم

منصور کا حکم تھا اس لیے اس کی ضرور تعمیل ہوئی ہوگی لیکن ابن زہر نے ان کتابوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس کا فیصلہ تم خود کر سکتے ہو۔[۱]

قاصد رقیب بودہ و من غافل از فریب
بے درد ' مدعا خودی اندرمیانہ ساست

عام لوگ تو اس نکتہ کو نہ سمجھے لیکن اشبیلیہ میں ایک شخص رہتا تھا جو ابن زہر کا پرانا دشمن اور حاسد تھا۔ اسنے ایک مضمون مختصر تیار کیا کہ ابن زہر خود فلسفہ کا بہت بڑا حامی ہے اور اس کے گھر میں اس فن کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں جو رات دن اس کے مطالعہ میں رہتی ہیں محضر پر بہت سے لوگوں کے دستخط کرائے اور منصور کے پاس بھیجا۔ منصور نے محضر کو پڑھ کر حکم دیا کہ عرضی دہندہ قید خانہ بھیج دیا جائے۔ وہ گرفتار ہو کر قید ہوا اور تصدیق کرنے والے ڈر کے مارے روپوش ہو گئے۔ منصور نے لوگوں سے کہا کہ اگر سارا اندلس جمع ہو کر شہادت دے تب بھی میں ابوبکر بن زہر کی نسبت کسی قسم کی بدگمانی نہیں کر سکتا۔[۲]

ابن رشد جب جلاوطن کیا گیا تو اس کے ساتھ اور بڑے بڑے فضلاء کو بھی شہر بدر کیے گئے۔ یعنی ابوجعفر ذہبی' ابوعبداللہ بن محمد براہیم قاضی بجایہ' ابوالربیع الکفیف' ابوالعباس۔

ابن رشد کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ غریب جہاں جاتا تھا ذلیل و رسوا کیا جاتا تھا خود اس کا بیان ہے کہ سب سے زیادہ مجھ کو جو صدمہ پہنچا یہ تھا کہ ایک دفعہ میں اور میرا بیٹا عبداللہ قرطبہ (کارڈوا) کی مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے کے لیے گئے لیکن نہ پڑھ سکے چند بازاریوں نے ہنگامہ مچایا اور ہم دونوں کو مسجد سے نکال دیا''۔

---

[۱] ابن ابی اصیبعہ ذکر حفید ابوبکر بن زہر۔ [۲]۔ ابن ابی اصیبعہ ۱۲

تاج الدین کا بیان ہے کہ جب میں اندلس گیا تو ابن رشد سے ملنا چاہا معلوم ہوا کہ معتوب سلطانی ہے اور کوئی شخص اس سے نہیں مل سکتا۔

ابن رشد کی گرفتاری اور ذلت پر عوام میں نہایت مسرت کا اظہار کیا گیا۔ شعرا نے تہنیت آمیز نظمیں لکھیں بعض اشعار یہ ہیں

لم تلزم الرشد بابن رشد
لما علا فی الزمان جدک
وکنت فی الدین ذاریاء
ما کان ھکذا جدک

دیگر

نفذ القضاء باخذ کل ممود
مللسف فی دینه متزندق
بالمنطق اشتغلوا فقیل حقیقة
ان البلاء موکل بالمنطق

دیگر

تفلسفوا وادعوا علوما
صاحبها فی المعاد یشقیٰ

واحتقروا الشرع وازدروه

سفاهة منهم وحمقا

منصور نے جو کچھ کیا تھا صرف ایک حکمت عملی تھی جس سے ایک فوری ہنگامہ کا فرو کرنا مقصود تھا۔ شورش کم ہوئی تو منصور نے پھر ابن رشد کو دوبارہ دربار میں بلانا چاہا۔ اظہار حق یا منصور کی خاطر سے اشبیلیہ کے چند معزز لوگوں نے شہادت دی کہ ابن رشد پر جو تہمت لگائی غلط اور افترا تھی۔ غرض سنہ ۵۹۵ھ میں ابن رشد کی قسمت کا چاند گہن نکلا اور منصور نے اس کا مراکش میں طلب کیا لیکن

عید ہوئی ذوق مگر شام کو

☆☆☆

ابن رشد کی وفات

ان وقت آیا تھا کہ ابن رشد اپنے فضل وکمال کی داد پاتا اور ارسطو کی طرح اس کے تاج فضیلت پر دولت کا طرہ بھی نظر آتا لیکن بے رحم موت نے اس کا موقع نہ دیا۔ مراکش پہنچ کر وہ بیمار رہا اور جمعرات کی رات صفر سنہ ۵۹۵ھ مطابق سنہ ۱۱۹۸ء میں مر گیا۔ شہر سے باہر جباشیہ کے ایک مقام ہے یہاں مدفون ہوا۔ لیکن ایک مہینہ کے بعد لوگوں نے قبر کھود کر ہڈیاں نکال لیں اور قرطبہ لے جا کر مقبرہ ابن عباس میں جو ابن رشد کا خاندانی قبرستان ہے دفن کیں۔ وفات کے وقت اس کی عمر ۷۵ برس کی تھی ۔ اس واقعہ کے بعد ایک مہینہ منصور نے بھی انتقال کیا۔

ابن رشد نے کئی اولادیں چھوڑیں۔ ایک بیٹا طب میں نامور ہوا۔ باقی نے فقہ کی طرف توجہ کی اور عہدہ قضا پر ممتاز ہوئے۔

ابن رشد کے اخلاق و عادات

ابن رشد کے اخلاق و عادات بالکل حکیمانہ تھے۔ وہ نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھا ایک مدت تک عہدہ قضا پر مامور رہا اور دربار سلطنت میں مقرب رہا لیکن اپنی دولت وجاہ سے بذات خود مطلق فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس کو جو کچھ ملتا تھا وطن اور اہل وطن پر صرف کرتا تھا۔ دربار شاہی کے تقرب سے بھی اس نے جو کام کیا وہ خلائق کاربراری اور عام نفع رسانی تھی۔

حلم اور عفو کی یہ حالت تھی کہ ایک شخص نے مجمع عام میں اس کا برا بھلا کہا اور سخت توہین کی وہ بجائے اس کے کہ مخالف سے انتقام لیتا الٹا مشکور ہوا کہ اس کی بدولت مجھ کو اپنے حلم کے جانچنے اور آزمانے کا موقع ملا۔ چنانچہ اس کے صلہ میں کچھ روپے نذر کیے' لیکن ساتھ ہی اس کو یہ نصیحت بھی کی کہ اوروں سے یہ سلوک نہ کرنا ورنہ ہر شخص اس قسم کے احسان کا قدردان نہیں ہوتا۔

مزاج میں انتہا درجہ کا رحم تھا۔ مدتوں قاضی رہا لیکن کبھی کسی قتل کی سزا نہیں دی۔ اور ایسا موقع آپڑتا تو عدالت کی مسند سے علیحدہ ہو جاتا اور کسی کو اپنا قائم مقام کر دیتا۔

مطالعہ اور کتب بینی کا بے انتہا شوق تھا۔ ابن الآبار کا بیان ہے کہ تمام عمر میں صرف دو راتیں ایسی گزریں کہ وہ کتب بینی اور مطالعہ سے باز رہا۔ ایک نکاح کی رات اور دوسری وہ رات جس میں اس کے باپ نے وفات پائی۔

انتہا درجہ کا فیاج اور سخی تھا۔ اس کی فیاضی دوست و دشمن پر یکساں تھی' کہا کرتا تھا کہ اگر میں صرف دوستوں کو دوں تو میں نے وہ کام کیا جس کو خود میرا دل چاہتا تھا' احسان اور

فضیلت یہ ہے کہ مخالفوں اور دشمنون کے ساتھ سلوک کیا جائے۔

وطن کا شیفتہ تھا۔ افلاطون نے جمہوریت پر جو کتاب لکھی ہے اس میں یونان کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ یہاں کے لوگوں کو تمام دنیا کی بہ نسبت علوم عقلیہ سے خاص مناسبت ہے۔ ابن رشد نے اس کتاب کی شرح میں اپنے وطن اسپین کو بھی یونان کا ہم پایہ قرار دیا ہے۔ جالینوس کا قول ہے کہ دنیا میں سب سے عمدہ آب و ہوا یونان کی ہے۔ ابن رشد نے کتاب الکلیات میں برخلاف اس کے یہ دعویٰ کیا کہ اس فخر کا مستحق یونان نہیں بلکہ قرطبہ (کارڈوا) ہے۔ ایک دفعہ منصور کے دربار میں ابن زہر اور ابن رشد میں یہ بحث ہوئی کہ اشبیلیہ اور قرطبہ یں کس کو ترجیح ہے۔ ابن زہر اپنے وطن اشبیلیہ کو ترجیح دیتا تھا۔ ابن رشد نے کہا کہ اشبیلیہ میں جب کوئی عالم مرجاتا ہے تو اور اس کے کتب خانہ کے فروخت کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو کتب خانہ کو قرطبہ لانا پڑتا ہے کیونکہ اشبیلیہ میں ان چیزوں کو کوئی پوچھتا بھی نہٰں لیکن قرطبہ میں جب کوئی مغنی اور کلانوت مرتا ہے تو اس کے آلات موسیقی اشبیلیہ میں جا کر فروخت ہوتے ہیں۔ ان واقعات سے دونوں شہروں کی فضیلت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ے االبن الآباد

ابن رشد کی تصنیفات

ابن رشد مختلف علوم و فنو ن میں کمال رکھتا تھا۔ اور تمام علوم و فنون میں اس کی تصنیفات موجود ہیں۔ ابن الآباد کی روایت ہے کہ موافق اس کی کل تصنیفات کے صفحے ۲۰ ہزار ہیں۔ جن علوم کو اس نے خاص طرح پر ترقی دی وہ فقہ' طب اور فلسفہ ہیں اور ان میں سے ہم بہ ترتیب ہر ایک علوم کی تصنیفات کی تفصیل پیش کرتے ہیں:

فقہ

وہ بہت بڑا فقیہ تھا اور مدتوں قضا کے منصب پر ممتاز رہ چکا تھا۔ اس تعلق سے اس نے فقہ میں حسب ذیل کتابیں لکھیں جو سب کی سب مقبول و متداول اور فہ مالکی کے ضروری ارکان ہیں۔

ا ھدایۃ المجتھد ونھایۃ المقتصد اس کتاب میں اس نے ہر مسئلہ کے دلائل ا لکھے ہیں ابو جعفر ذہبی کا قول ہے کہ فقہ میں اس۔ کتاب میں نے نہیں دیکھی۔ نفح الطیب میں ابن قول نقل کیا ہے کہ کتاب جلیل معظم معتمد عند المالکیہ

۲ تحصیل: اس میں صحابہ' تابعین اور تبع تابعین ۔
اختلافات اوران کے دلائل لکھے ہیں۔اورخود محا
فیصلہ کیا ہے۔

۳ مقدمات: ہم نے یہ کتاب سید محمود مرحوم کے لیے کتب
خدیویہ سے نقل کراکر منگوائی تھی۔خیال تھا کہ ایک
فقہ کے فن کو لکھے گا تو کیونکر لکھے گا لیکن کتاب کو پڑھ
کچھ استعجاب نہیں ہوا۔ بے شبہ فقہ کی اور کتابوں ک
وہ زیادہ صاف مرتب اورقریب الفہم ہے لیکن ف
تدقیقات کا پتہ نہیں ابوزید وبوسی کی کتاب ''الاس
نے دیکھی ہے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اصول فقہ

اس فن میں اس کی دو کتابیں ہیں:

۱ منہاج الادلۃ: مستقل تصنیف ہے۔

۲ خلاصۃ المستصفی: امام غزالی نے اخیر عمر میں مستصفی ایک کتا
تھی' یہ اس کا خلاصہ ہے۔

طب

طب میں ابن رشد کی تصنیفات نہایت کثرت سے ہیں۔اور اس فن مُں اس نے بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ یہ تصنیفات دو قسم کی ہیں۔ایک جو اس نے بطور خود لکھی ہیں ان میں کتاب الکلیات نہایت جامع اور محققانہ ہے۔اس کے سوا اور چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں مثلاً مقالۃ فی المزاج مقالۃ فی نوائب الحمیٰ۔

دوسرے وہ جو یونانی تصنیفات کا خلاصہ یا شرحیں ہیں۔ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱	شرحکتاب الاستطقسات لجالینوس	۵	تلخیص کتاب التعرض لجالینوس
۲	تلخیص کتاب المزاج لجالینوس	٦	تلخیص کتاب الحمیات لجالینوس
۳	تلخیص کتاب القوی لجالینوس	۷	تلخیص کتاب الادویۃ المفردہ لجالینو
۴	تلخیص کتاب العلل و الاغراض لجالینوس	۸	تلخیص النصف الثانی من کتاب ج لجالینوس

فلسفہ و کلام

علم کی بدقسمتی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ وہ شخص جو فلسفہ ارسطو کو سب سے بڑا مفسر تھا۔ جس کے فلسفہ نے دو سو برس تک یورپ پر حکمرانی کی جس نے بو علی سینا کی غلطیوں کی اصلاح کی جس نے ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی جس نے اشاعرہ کے طلسم کو توڑ دیا، جس کے افادات کے لیے بیس ہزار صفحے درکار ہوئے آج اس کی تصنیفات اس طرح مفقود ہیں کہ کہیں دو چار ہاتھ آجاتے ہیں تو شائقین فن سمجھتے ہیں کہ کیمیا ہاتھ آگئی۔

اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ اس کی تصنیفات خود اس کے زمانہ میں برباد کی گئیں۔ کچھ یہ کہ اسپین کی تصنیفات ممالک مشرقیہ میں کم پھیلیں اور اسپین خود تباہ کیا گیا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ عیسائیوں نے جب اسپین پر قبضہ کیا تو سب سے زیادہ انھوں نے مسلمانوں کے علمی کارناموں پر توجہ کی اسپین میں جب انکوئزیشن کا محکمہ قائم ہوا جس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جو کتابیں عقائد عیسویں کے خلاف ہوں وہ برباد کردی جائیں تو کارڈینل کریمن نے جو اس محکمہ کا ایک ممبر تھا غرناطہ (گدینڈا) میں ۸۰ ہزار عربی زبان کی کتابیں جلا دیں۔ ابن رشد کی تصنیفات بھی اسی بدقسمت ذخیرہ میں شامل تھیں۔

تاہم ابن رشد کی تصنیفات ارباب فن میں اس قدر مقبول ہو چکی تھیں کہ یہ بالکل ناپید نہ ہوسکیں۔ ان تصنیفات کا بڑا ذخیرہ اسکوریال کی خانقاہ میں موجود ہے، جو مڈرڈ پائے تخت اسپین سے ۴۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے اوری اور فرانس کے کتب خانوں میں ابن رشد کی بہت ی تصنیفات عبرانی خط میں لکھی ہوئی موجود ہیں۔

یہ اصل عربی نسخوں کا حال ہے۔ باقی ان کتابوں کے عبرانی اور لاطینی ترجمے ان کی تفصیلی کیفیت سے آگے آتی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ عبرانی اور لاطینی زبان میں ابن رشد کا کل کارنامہ محفوظ ہے۔ لیکن مسلمانوں میں ان زبانوں کے زباندان کہاں ہیں۔

ابن رشد کی جو تصنیفات ہماری نظر سے گزریں حسب ذیل ہیں۔

۱	فضل المقال	یہ دونوں رسالے یورپ کی کوششوں سے
	مناہج الادلۃ	آئے اور یورپ میں اول اول چھپے
۲	تہافتہ	مصر میں چھپ گیا ہے
۳	مابعد الطبیعہ لارسطو	قسطنطنیہ میں چھپا ہے۔
۴	شرح کتاب القیاس لارسطو	ایک قلمی نسخہ آرہ مدرجہ احمدیہ میں موجود ہے
۵	تلخیص کتاب الشعرو الخطابۃ لارسطو	اس کتاب کے جستہ جستہ مقامات پر شیخو نے علم الادب میں شامل کیے ہیں۔

فلسفہ میں اس نے مستقل کتابیں بہت کم لکھیں۔ اس کی تمام تر تصنیفات ارسطو کی تصنیفات کی شرح یا خلاصہ ہیں۔ چنانچہ تفصیل حسب ذیل ہے:

شمار	نام کتاب	مضمون
۱	جوامع کتب ارسطو فی الطبیعیات والالہیات	ارسطو نے طبیعیات اور الٰہیات میر قدر
۲	کتاب الضروری فی المنطق	منطق میں ہے اور جوامع کا ضمیمہ۔
۳	تلخیص کتب ارسطو	ارسطو کی تمام کتابوں کا خلاصہ ہے۔

۴	تلخیص کتاب الکون و الفساد لارسو	
۵	تلخیص مابعد الطبیعۃ لارسطو	ارسطو نے امور عامہ پر جو کتاب لکھ اس کا خلاصہ ہے
۶	تلخیص کتاب الاخلاق لارسطو	ارسطو کی کتاب الاخلاق کا خلاصہ
۷	تلخیص کتاب البرہان لارسطو	ارسطو کے فن برہان پر جو کتاب لکھ اس کا خلاصہ
۸	شرح کتاب السماء والعالم لارسطو	کائنات الجو کے متعلق ارسطو کی کتا شرح ہے
۹	تلخیص کتاب السماع الطبیعی لارسطو	
۱۰	شرح کتاب النفس لارسطو	ارسطو نے روح پر جو کتاب لکھی تھ کی شرح ہے۔
۱۱	شرح کتاب القیاس لارسطو	
۱۲	تلخیص الالٰہیات نیقولاوس	نیقولاؤس کے الٰہیات کا خلاصہ ہے

یہ وہ کتابیں ہیں جو ارسطو وغیرہ کی تصانیف کا خلاصہ یا شرحیں ہیں مستقل تصنیفات حسب ذیل ہیں:

شمار	نام کتاب	مضمون
۱	رسالہ مقالۃ فی العقل	اس بحث میں ہے کہ عقل ہیولانی اج تک پہنچ کر روحانیات محض کا ادراک کر سکتی نہیں۔

۲	رسالہ	یہ ثابت کیا ہے کہ عالم کی خلقت طرح اہل اسلام مانتے ہیں اور جو ارسطو نے کیا ہے دونوں قریب قریب ہیں۔
۳	رسالہ	ارسطو اور ابو نصر کی منطق میں جو تصنیف ہیں ان کا موازنہ کیا ہے اور دونوں میں جو اخ ہے اس کو بتایا ہے۔
۴	رسالہ	عقل کو انسان سے کس قسم کا تعلق ہے
۵	رسالہ	الٰہیات شفا کے چند مسائل کی تنقید۔
٦	رسالہ	زمانہ کی حقیقت بیان کی ہے۔
۷	رسالہ	مادہ اول کے وجود پر ارسطو نے استدلال کیا تھا اس پر کسی نے اعتراض کیا تھ جواب ہے۔
۸	رسالہ	بوعلی سینا کے اس مسئلہ کو رد کیا۔ وجودات کی تین قسمیں ہیں واجب بالذات بالذات واجب بالغیر و ممکن مطلق۔
۹	رسالہ	بونصر فارابی اور ارسطو میں برہان کی اور حدود کے متعلق جو اختلافات ہیں ان کو بیا ہے۔
۱۰	فصل المقال	شریعت اور فلسفہ میں جو تعلق ہے بیان کیا ہے۔

۱۱	مناہج الادلۃ	مہات عقائد اسلام کو دلائل عقلیہ ثابت کیا ہے۔
۱۲	تہافتہ التہافتہ	امام غزالی کی تہافتہ الفلاسفہ کا رد ہے۔

ابن رشد کی تصنیفات کی کثرت تنوع جدت مضامین تحقیق وتنقید جس قدر حیرت خیز ہے اس سے زیادہ یہ امر تعجب انگیز ہے کہ تمام تصنیفات نہایت کثیر الشغالی اور پریشانی کی حالت میں ہیں۔ وہ قاضی القضاۃ اور افسر صیغہ عدالت تھا۔ اس تعلق سے وہ مراکو اور اسپین کے تمام بڑے بڑے اضلاع کا دورہ کرتا رہتا تھا۔ انہی دوروں میں تصنیف وتالیف کا شغل بھی رہتا تھا۔ کتاب الحیوان کی شرح میں خود اس نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ماہ صفر سنہ ۵۶۵ ھ میں بمقام اشبیلیہ تمام ہوئی پھر عذر خواہی کی ہے کہ "اگر اس کتاب میں سہو وخطا ہوگئی ہو تو معافی کی امید ہے۔ کیونکہ اول تو کار منصبی سے فرصت نہیں ملتی دوسرے کتب خانہ وطن میں ہے اور ضروری کتاب ساتھ نہیں"۔ اسی قسم کی عذر خواہی کتاب الطبیعہ کی شرح میں کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ کتاب رجب سنہ ۵۶۵ ھ میں بمقام اشبیلیہ تمام ہوئی۔ مجسطی کا جو اختصار کیا ہے اس میں لکھا ہے کہ "میں نے صرف اہم اور مقدم مطالب لے لیے ہیں میری حالت بالکل اس شخص کی سی ہے جس کے مکان کو آگ لگ گئی ہو اور وہ گھبراہٹ اور اضطراب میں صرف مکان کی ضروری اور قیمتی اسباب نکال نکال کر پھینک رہا ہو" کتاب الالٰہیات اور کتاب البیان سنہ ۵۷۰ ھ کے آغاز میں ساتھ ساتھ لکھنی شروع کی تھیں۔ اسی اثناء میں بیمار ہوگیا اور زیست کی امید نہیں رہی۔ اس خیال سے کتاب البیان کو چھوڑ کر الٰہیات کی تکمیل میں مصروف ہوگیا تا کہ کتاب البیان کے ساتھ کہیں یہ بھی نہ رہ جائے۔ جوہر الکون پر جو رسالہ لکھا ہے وہ مراکو میں سنہ ۵۷۴ ھ میں تمام ہوا۔ لیکن ۵۷۵ ھ میں پھر اشبیلیہ واپس جانا پڑا۔ یہاں اس نے فقہ پر ایک کتاب لکھی۔ اس سنہ میں ابن طفیل کی وفات کی وجہ سے منصور

نے اس کو مراکو میں بلالیا اور اپنا طبیب خاص مقرر کیا۔

یہ ایاب و ذہاب کثرت اشغال' پریشانی اور پراگندہ دلی کوئی چیز اس کو اپنے اشغال سے نہ روک سکی اور یہ ابن رشد کی خصوصیت نہیں بزرگان اسلام میں عموماً یہ ادا پائی جاتی ہے کہ انقلابات مزانہ کی بادصرصران کے اوراق حواس کو پریشان نہیں کرسکتی۔ امام رازی بوعلی سینا امام غزالی' شہاب مقتول وغیرہ کے جو کارنامے ہیں وہ بھی اسی قسم کی بے سروسامانی اور پریشانی کے زمانہ کے یادگار ہیں۔

یورپ میں فلسفہ ابن رشد کی اشاعت[1]

یورپ میں ابن رشد کی تصنیفات کی جس طرح اشاعت ہوئی اور اس کا اثر جو

---

[1] اس مضمون کے متعلق چند باتیں کردینی ضروری ہیں:

اول یہ کہ یہ مضمون تمام تر پروفیسر رینان کی کتاب ''سوانح ابن رشد'' سے ماخوذ ہے لیکن پروفیسر مذکور نے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

یورپ پر پڑا۔ وہ ایک دلچسپ داستان ہے۔ لیکن اس کے بیان کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ یورپ میں عام فلسفہ عرب کی اشاعت کی ابتدا کی مختصر کیفیت بیان کی جائے۔

یورپ جس زمانہ میں مسلمانوں سے صلیبی لڑائیاں لڑ رہا تھا اس وقت مسلمانوں کی نسبت یورپ کے عجیب عجیب خیالات تھے لیکن جب اسلامی ممالک

(بقیہ حاشیہ) اس مضمون کو اس قدر وسعت سے لکھا ہے کہ کئی سو صفحوں میں ادا ہوا ہے میں کبھی فرصت کے وقت پورے مضمون کو اردو میں لانے کی کوشش کروں گا لیکن اس وقت میں رینان کی کتاب کی طرف رجوع نہ کر سکا بلکہ الجامعہ کے ایڈیٹر نے رینان کی کتاب کا عربی میں جو نہایت ناتمام خلاصہ لکھا ہے اس کو مختصر طور پر ادا کر دیا ہے۔

یہ امر خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ اس مضمون میں جن یورپین پروفیسروں اور مصنفوں کے نام آئے ہیں ان کا تلفظ بدل گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ فرنچ تلفظ انگریزی تلفظ سے بہت مختلف ہے۔ اس پر مزید یہ کہ الجامعہ کے ایڈیٹر نے ان ناموں کو معرب کر کے لکھا ہے اور میں نے اس کی پیروی کی ہے فرنچ تلفظ عربی کے قالب میں ڈھل کر انگریزی تلفظ سے بالکل بیگانہ ہو گیا ہے۔ اور انگریزی خوانوں کو یہ نام بالکل اجنبی معلوم ہوں گے۔

اس مضمون میں اصلی جو چیز لحاظ کے قابل ہے یہ ہے کہ مسلمان اگرچہ اپنے علوم و فنون اور اپنے اسلاف کی یادگاروں کی پرستش کے بڑے دعوے دار ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر ان کو سخت حیرت ہو گی کہ ابن رشد جس کی تصنیفات کا ان کو نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ یورپ میں ایک مدت سے اس کی تصنیفات تمام بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں داکل درس رہیں۔ اور سینکڑوں اہل فن ان تصنیفات کے شروح و حواشی لکھنے میں مصروف تھے۔ اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوگا کہ یورپ نے یونان اور عربی فلسفہ کو اب جو نظر انداز کیا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔

میں اہل یورپ کا گزر ہوا اور ان کو ہر طرف مسلمانوں کے علمی اور عملی ترقیوں کے عجیب و غریب منظر نظر آئے تو سب سے پہلا اثر جو یورپ کے دل پر پڑا وہ مسلمانوں کی علمی

فضیلت کا اعتراف تھا۔ یورپ کی یہ فیاض دلی رشک کے قابل ہے کہ ایک طرف تو مذہبی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا لیکن دوسری طرف اس نے بے تکلف مسلمانوں کے خوان کرم سے زلہ ربائی شروع کردی۔

سب سے پہلے طلیلیہ (ٹالیڈو) کے لارڈ بشپ نے جس کا نام ڈریمورنڈ تھا سنہ ۱۱۳۰ء میں ایک محکمہ اس غرض سے قائم کیا کہ اسلامی فلسفیانہ تصنیفات عربی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کی جائیں۔ اس محکمہ کے ارکان وہ یہودی علماء تھے جو عربی زبان اور عربی فلسفہ کے ماہر تھے۔ ان میں سب سے ممتاز یوحنا تھا جو اشبیلیہ کا رہنے والا تھا۔ اس محکمہ کا افسر گولند لسالفی مقرر ہوا۔ اس محکمہ نے ابن سینا کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں۔ چند روز بعد دی کریمون اور الفرڈوئی مولائی نے فارابی اور کندی کی بعض بعض تصنیفیں بھی ترجمہ کیں۔

اسی زمانہ میں جزیرہ سسلی اور پنولی میں بھی عربی کتابوں کا ترجمہ شروع ہوا۔

یہ ابتدائی حالت تھی لیکن فلسفہ عرب کی اشاعت کا اصلی زمانہ درحقیقت فریڈرک دوم سے شروع ہوتا ہے جو جرمنی کا مشہور فرمانروا گزراہ۔ ی علم پرور بادشاہ درحقیقت یورپ کا مامون الرشید تھا۔ اس کی طبیعت فطرتاً فلسفیانہ واقع ہوئی تھی۔ اور جس قدر مذہبی گروہ اس کے خیالات کی مخالفت کرتا تھا اس کا میلان فلسفہ کی جانب اور بڑھتا جاتا تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں عموماً علم وفن کے سرچشمہ اہل عرب تسلیم کیے جاتے تھے۔ اس نے ایک سسلی کے باشندہ سے عربی زبان سیکھی اور عرب کے رسم ورواج کا اس قدر شیفتہ ہوا کہ مشرقی بادشاہوں کی طرح اس نے حرم اور خواجہ سرا مقرر کیے دور دور سے عربی داں فضلاء جمع کیے۔ یہاں تک کہ بغداد کے علماء وفضلاء بھی اس کے دربار میں پہنچے جو بڑی چوڑی آستینوں والی عبائیں زیب بدن کرتے تھے۔

فریڈرک علانیہ عرب کے علوم وفنون ومراسم کی مداحی کرتا تھا۔ حالانکہ یہ امر اس کے

تمام دربار کو سخت ناگوار گزرتا تھا۔ بااین ہمہ صلیبی لڑائیوں کے سلسلے میں یورپ نے جب بیت المقدس پر چھٹا حملہ کیا تو بادشاہ بھی ایک فوج کثیر کے ساتھ اس حملہ میں شریک تھا۔ لیکن یہاں بھی وہ علمی مشاغل سے کالی نہ رہا۔ مسلمان علماء کو اپنی مجلس میں بلاتا تھا اور ریاضی کے مشکل مسائل ان سے حل کراتا تھا۔ ان مسائل کو وہ اسلامی فوج کے سپہ سالا کے پاس بھی حل کرنے کی غرض سے بھیجتا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کے ساتھ وہ سخت لڑائیاں کرتا تھا۔ لیکن مذہب کی یہ حالت تھی کہ ہیکل مقدس میں جا کر حضرت عیسیٰ کی مقدس زیارت گاہ کی ہنسی اڑاتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن لارڈ بشپ کے سامنے جا کر بھی اس نے اسی قسم کی تمسخر آمیز باتیں کیں جن کو بشپ نے قلم بند کرلیا۔

عیسائی عموماً اس کو برا سمجھتے تھے اور خصوصاً پادریوں نے تو اس کی ہجو میں نظمیں لکھیں۔

پوپ نہم گریگوریس نے اپنی ایک تحریر میں اس کی نسبت فتویٰ دیا تھا کہ یہ بادشاہ فساد کا بادشاہ ہے کیونکہ وہ اس بات کا قائل ہے کہ جب تک کوئی چیز عقل اور نظام طبعی سے ثابت نہ ہو اس کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔

عام عیسائی جماعت نے اس کو دجال کا خطاب دے رکھا تھا لیکن اس نے ان تمام باتوں کی مطلق پرواہ نہ کی اور نہایت آزاددلی سے عربی کتابیں ترجمہ کرائیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ابن رشد کے یہودی تلامذہ اسپین سے نکل کر مختلف ممالک میں پھیل گئے تھے۔ ان میں سے ایک خاندان جو طبیون کہلاتا ہے۔ اسپین سے ہجرت کر کے فرانس چلا آیا تھا۔ ان میں موسیٰ بن طبیون اور سمویل بن طبیون نے ابن رشد کی بعض کتابیں عبرانی میں ترجمہ کیں۔ ابن رشد کی تصنیفات کا یہ پہلا ترجمہ تھا۔ شہنشاہ فریڈرک نے جب اسلامی کتابوں کا ترجمہ کرانا چاہا تو ان یہودی علماء کو اس نے دربار میں بلایا اور یہ خدمت ان کے

سپرد کی۔ یہودا ابن سلیمان جو ٹالیڈو کا رہنے والا تھا اور فریڈرک کے خاص مقربین میں سے تھا اس نے سنہ ۱۲۴۷ء میں ایک کتاب لکھی جس کا نام طلب الحکمۃ رکھا۔ یہ کتاب تمام تر ابن رشد کی تصنیفات سے ماخوذ تھی۔ ایک اور یہودی عالم جس کا نام یعقوب بن ابی مریم تھا اور جونیپولی میں مقیم تھا۔ اور خاندان طیبون کا داماد تھا اس نے سنہ ۱۲۳۲ء میں شہنشاہ فریڈرک کی فرمائش سے ابن رشد کی متعدد تصنیفات ترجمہ کیں۔ اس کے بعد کالونیم نے جوارل کا باشندہ تھا اور سنہ ۱۲۸۷ میں اس کی ولادت ہوئی تھی ابن رشد کی کتابوں کا عبرانی زبان میں ترجمہ شروع کیا۔ وہ لاطینی زبان بھی جانتا تھا۔ چنانچہ تہافۃ التہافۃ کا ترجمہ بھی اس نے لاطینی ہی زبان میں کیا جو سنہ ۱۳۲۸ء میں انجام کو پہنچا۔

غرض چودھویں صدی کے آغاز تک ان رشد کا فلسفہ تمام یہود میں پھیل گیا۔ اسی زمانہ میں ایک یہودی فاضل نے جس کا نام لادی حوشون تھا۔ اور جس کو اہل یورپ لادن افریقی کے نام سے یاد کرتے تھے ابن رشد کے فلسفہ کی اسی طرح شرح اور خلاصیلکھے جس طرح ابن رشد نے ارسطو کے فلسفہ کی شرح اور تلخیص ی تھی۔ یہ فاضل بالکل آزادخیال تھا۔ وہ مادہ کے قدیم ہونے کا قائل تھا نبوت کی نسبت اس کا یہ اعتقاد تھا کہ وہ انسانی قوتوں سیا یک قوت کا نام ہے۔ اس نے یہودی مذہب کو فلسفہ سے ملانا چاہا اور فلسفہ اور مذہب میں تطبیق کی۔ ان یہودی حکماء میں سب سے آخر شخص الیاس مدیجو تھا جو پیڈوا کی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔

سولہویں صدی عیسوی میں یہود کے مذہبی علماء نے یہ دیکھ کر کہ فلسفہ مذہب کو برباد کیے دیتا ہے بڑے زورشور سے فلسفہ کی مخالفت شروع کی۔ چنانچہ میشو نے جو مذہبی حیثیت سے ربی کا لقب رکھتا تھا۔ امام غزالی کی کتاب تہافۃ الفلاسفہ سنہ ۱۵۳۸ء میں شائع کی جس سے ابن رشد کی مخالفت کا اظہار مقصود تھا۔

اس وقت تک ابن رشد کے فلسفہ کی جو کچھ اشاعت اور ترویج ہوئی تھی زیادہ تر

یہودیوں میں ہوئی تھی۔اور وہی فلسفہ ابن رشد کے حامی اور پیرو خیال کیے جاتے تھے اب وہ زمانہ آیا کہ تمام یورپ میں ابن رشد کے فلسفہ نے رواج پایا۔

سب سے پہلا شخص جس نے یہ خدمت سنہ ۱۲۳۰ء میں انجام دی میکال اسکاٹ تھا۔ یہ فاضل ٹالیڈو (طلیطلہ) میں قیام رکھتا تھا۔اور شاہ فریڈرک جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اس کے درباریوں میں تھا۔

اسکاٹ کے بعد مارسن نے جو خاص جرمنی کا رہنے والا تھا ابن رشد کے فلسفہ کی اشاعت کی ۔ یہ فاضل بھی فریڈرک کے دربار میں ایک معزز حیثیت رکھتا تھا۔اس کے بعد اسس طرف عام توجہ ہوئی یہاں تک کہ تیرھویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے ابن رشد کی تمام فلسفیانہ تصنیفات لاطینی زبان میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔

ابن رشد کے فلسفہ کی مخالفت

ابن رشد کے خیالات کا یورپ میں پھیلنا تھا کہ تمام عیسائیون کی مذہبی جماعت میں ایک آگ سی لگ گئی۔سنہ ۱۲۰۹ء میں ایک بڑا مذہبی جلسہ منعقد ہوا جس نے پیروان ابن رشد کی گمراہی کا فتویٰ دیا۔

سنہ ۱۲۱۵ء میں عیسائی مذہبی محکمہ نے یہ فتویٰ نافذ کیا کہ فلسفہ ارسطو اور تصنیفات بو علی سینا کر پڑھنا پڑھانا حرام ہے۔سنہ ۱۲۳۱ء میں پوپ نہم نے جس کا نام گریگیوریوس تھا حکم دیا کہ عرب کے فلسفہ کا پڑھنا پڑھانا قطعا بند کر دیا جائے۔

گولیم ڈفرن جو ایک مشہور فاضل تھا۔اس نے نہایت سختی سے ابن سینا کے فلسفہ کا رد لکھا ڈفرن کے بعد پیر نے جو بہت بڑا متکلم تسلیم کیا جاتا تھا فلسفہ عرب کے رد میں بہت سی

کتابیں لکھیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ بوعلی سینا کا مداح تھا۔ اور ابن رشد کو اس وجہ سے برا سمجھتا تھا کہ اس نے بوعلی سینا کی مخالفت کی تھی۔

مخالفین ابن رشد میں سب سے زیادہ شہرت سینٹ ٹامس نے حاصل کی ۔ یہ شخص مغربی کلیسا کا سب سے بڑا متکلم اور عالم خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے ابن رشد کے فلسفہ کو نہ صرف مذہبی بلکہ عقلی دلائل سے بھی رد کیا اور چونکہ ابن رشد فلسفہ ارسطو کا سب سے بڑا شارح خیال کیا جاتا تھا۔ ابن رشد کے مقابلہ میں وہ دلائل استعمال کیے جو ارسطو کے دلائل سے ماخوذ تھے۔

پادریوں نے اس خدمت کے صلہ میں اس کی اس قدر عزت کی کہ اس کو ایک مقدس مذہبی امام قرار دیا۔ چودھویں صدی کے ایک مشہور مصور نے سنہ ۱۳۴۰ء میں ایک عمدہ مرقع بنایا جو مقدس کاترین کے گرجا بمقام بیزہ (اٹلی) میں نصب کیا گیا۔ اس مرقع کی صورت یہ تھی کہ سب سے اوپر ذات مقدس جلوہ گر ہے جس کے چاروں طرف ملائکہ صف بستہ ہیں۔ ذات مقدس سے نور کی شعاعیں منتشر ہوتی ہیں نیچے بادل کی سطح پر حضرت موسیٰ پولوس اور اناجیل اربعہ ہیں۔ اور نور کی شعاعیں ان پر آ کر پڑتی ہیں بادل کے نیچے مقدس ٹامس کھڑا ہے جس پر نور کی شعاعیں حضرت موسیٰ وغیرہ سے گزر کر پڑتی ہیں۔ ان شعاعوں کے علاوہ نور کی تین شعاعیں براہ راست ذات مقدس سے ٹامس پر پڑتی ہیں۔ ذرا نیچے دونوں ارسطو اور افلاطن کھڑے ہیں ان دونوں کے ہاتھ میں دو کتابیں ہیں جن سے نور کا ایک سلسلہ بند ہو کر ٹامس کے سر تک پہنچتا ہے اور ذات الٰہی کے نور میں مخلوط ہو جاتا ہے۔ ٹامس کرسی پر جانشین ہے اس کے ہاتھ میں کتاب مقدس جو کھلی ہوئی ہے اور جس کے ہر صفحہ پر یہ عبارت ہے "میرا منہ سچ بولتا ہے اور میرے ہونٹھ گمراہی سے منکر ہیں" ٹامس کی کرسی کے چاروں طرف ہر درجے کے مقدس پادریوں کی قطار ہے جن پر ٹامس کی تصنیفات کی شعاعیں پڑ

رہی ہیں۔انہی شعاعوں میں سے ایک شعاع ابن رشد پر پڑ رہی ہے جو ٹامس کے سامنے زمین پر پچھڑا ہوا پڑا ہے

ابن رشد کے جن مسائل کا رد لکھا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ مادہ ازلی ہے اور اس کی حقیقت نہیں معلوم ہو سکتی۔

۲۔ سلسلہ کائنات کا اتصال اولیٰ جس طرح ابن رشد نے بیان کیا تھا۔

۳۔ علت اولیٰ اور معلومات میں عقل کا توسط۔

۴۔ کوئی شے عدم محض سے وجود میں نہیں آ سکتی۔

ٹامس نے ان مسائل کو باطل ثابت کیا ہے یہ دعویٰ کیا کہ اصل میں ارسطو نے غلطی کی تھی اور حکمائے اسلام نے غلطی پر غلطی کی۔

ٹامس کی وفات کے بعد ریمون مارتینی نے فلسفہ عرب کی مخالفت میں کتابیں لکھیں۔لیکن ان تصنیفات میں اس نے زیادہ تر امام غزالی سے مدد لی وہ کہا کرتا تھا کہ فلسفہ کا رد فلسفی (غزالی) کی زبان سے زیادہ موزوں ہے۔

ریمون کے بعد بہت سے مصنفین نے ٹامس کی حمایت کی اور فلسفہ عرب کی مخالفت میں کتابیں لکھیں ان میں یہ مذاق اس قدر بڑھا کہ اٹلی کے مشہور شاعر ڈینٹی نے بھی ابن رشد کی ہجو لکھی۔اس کے بعد جیل دی روم نے بڑے زور شور سے فلسفہ عرب خصوصاً ابن رشد کے فلسفہ پر حملہ یا اور اس میں اس قدر ناموری حاصل کی کہ مقدس ٹامس کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔

لیکن اس میدان میں جو شخص سب کا پیشرو تھا وہ ریمون تھا یہ شخص دو بر بعد یعنی سنہ ۱۳۱۰ء سے سنہ ۱۳۱۲ء تک پیرس سے لے کر جنیوا نیپولی بزہ وغیرہ کا صرف اس غرض سے دورہ کرتا رہا کہ لوگوں کو فلسفہ عرب کی مخالفت پر آمادہ کرے۔یہاں تک کہ جب سنہ ۱۳۱۱ء میں

ویانا میں ایک مجلس منعقد ہوئی تو اسنے پوپ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی جس میں تین باتوں کی درخواست کی۔ایک یہ کہ ایک بڑا لشکر مسلمانوں کے برباد کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔دوسری یہ کہ عربی زبان کی تعلیم کے لیے یونیورسٹیاں قاء کی جائیں۔تیسری یہکہ ابن رشد کی تصنیفات کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دے دیا جائے۔

حامیان ابن رشد

مذہبی جماعت میں اگرچہ فلسفہ عرب کی نسبت اس قدر شورش برپا تھی لیکن فلسفہ کا جادوایسا نہ تھا کہ کوئی جماعت اس سے بے اثر رہ سکتی۔مذہبی ہی گروہ میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہوگیا جس نے نہایت استقلال اور دلیری سے فلسفہ عرب کی حمایت کی۔ یہ فرقہ فرانسیسکن کہلاتا ہے۔ان لوگوں نے بڑی آزادخیالی اور دلیری سے روما کی سطوت حکومت کا مقابلہ کیا اور ٹامس کے رد میں کتابیں لکھیں چونکہ یہ لوگ ٹامس کے عقائد کے ابطال کو اپنا اصلی فرض سمجھتے تھے اس لیے ان کو خواہ مخواہ فلسفہ عرب سے اعانت لینی پڑی۔

اس فرقہ کے مشہور لیڈر جان دی لاروشل نے علانیہ ابن سینا کی پیروی کا اظہار کیا اور علم النفس واخلاق کی نسبت اس نے جو کچھ لکھا تمام تر ابن سینا کی تصنیفات سے لکھا۔اب فرانس کی مذہبی تعلیم گاہ دوفرقوں میں تقسیم ہوگئی۔سربون ک مدرسہ مُں ٹامس کے معتقدات کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن پیرس یونیورسٹی میں ابن رشد کا فلسفہ پڑھایا جاتا تھا۔ڈمینکین فرقہ سوربون کی تعلیم کا حامی تھا۔ چنانچہ ان دونوں نے متفق ہوکر پوپ چہارم سے جس کا نام الیگزینڈر رتھا چھ سات برس کے عرصہ میں چالیس فرمان اس مضمون کے صادر کرائے کہ عرب کے فلسفہ کا پڑھنا پڑھانا حرام ہے۔سنہ ۱۲۶۹ء میں پیرس کی مذہبی مقدس مجلس نے یہ فرمان

صادر کیا۔

یہ جلسہ ان لوگوں کے فاسدہ العقیدہ ہونے کا فتویٰ دیتا ہے جو اعتقادات ذیل کے قائل ہیں:

۱۔ عالم ازلی ہے۔

۲۔ تمام انسانوں میں ایک ہی عقل پائی جاتی ہے۔

۳۔ انسان کا سلسلہ کسی ایک آدم معین تک منتہی نہیں ہوتا۔

۴۔ نفس جسم کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے۔

۵۔ خدا جزئیات کا عالم نہیں ہے۔

۶۔ خدا قابل فنا چیزوں کو ابدی نہیں کرسکتا۔

ان سب ہنگاموں کے ساتھ ابن رشد کا فلسفہ یورپ میں برابر پھیلتا گیا۔ یہاں تک کہ چودھویں صدی عیسوی میں بڑا حصہ یورپ کا ابن رشد کا پیرو بن گیا۔ چنانچہ فرانس کیمشہور بادشاہ یولس یاز دہم نے سنہ ۱۴۷۳ میں جب صیغہ تعلیم کی اصلاح کرنی چاہی تو پروفیسروں کو حکم دیا کہ ارسطو کی تصنیفات پر ابن رشد کی جو شرحیں ہیں وہ نصاب میں شامل کی جائیں۔ اب یہ نوبت پہنچی کہ تمام یورپ میں ابن رشد کا فلسفہ علانیہ پڑھا جاتا تھا اور کوئی مخالفت نہیں کرسکتا تھا۔

پیڈوا کی یونیورسٹی

ابن رشد کے فلسفہ نے اگرچہ تمام یورپ میں رواج پایا لیکن اعلیٰ صدر مقام اس فلسفہ کا پیڈوا کی یونیورسٹی تھی جو اٹلی میں واقع تھی۔ اس یونیورسٹی میں سب سے پہل جس نے

ابن رشد کے فلسفہ کو داخل کیا پطرس دابانو تھا۔اب یورپ کے تمام علمی طبقہ میں ابن رشد کی یہ عزت کی جاتی تھی کہ لوگ اس کے نام پر فخر کرتے تھے۔

اس یونیورسٹی میں سب سے پہلے ابن رشد کی طبی تصنیفات کی تعلیم شروع ہوئی پھر رفتہ رفتہ اس کے فلسفہ نے رواج پایا۔اس تعلیم کا بانی اول پیٹر وابانو تھا۔اس زمانہ مُں یورپ تعصب کا یہ حال تھا کہ اس کے مرنے کے بعد پیٹر مذکور پر انکویزیشن (مجلس تحقیقات) نے فرد قرار جرم قائم کی۔اور یہ فیصلہ ہوا کہ اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر جلادی جائیں۔چنانچہ اس فیاضانہ حکم کی تعمیل بھی ہوئی لیکن فلسفہ ابن رشد کا ہر قدم آگے بڑھتا جاتا تھا۔پیڈوا کی یونیورسٹی کیماتحت اور جو بہت سی یونیورسٹیاں تھیں سب میں اس کے فلسفہ نے رواج پایا تمام اونچی سوسائٹیوں کے ممبر اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم فلسفہ ابن رشد کی پیرو ہیں۔ بااین ہمہ یورپ کا تعصب بھی اپنا کام کرتا جاتا تھا یہاں تک کہ متعصبین کی جماعت میں پیٹر یارک ایک شخص پیدا ہوا جو نہ صرف ابن رشد بلکہ عام طور پر فلسفہ عرب کا دشمن تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ پیٹر یارک ہی اس زمانے کا سب سے پہلا شخص تھا جس نے یورپ کو یونانی علوم وفنون پر تعلیم پر آمادہ کیا۔وہ اپنے دوست جان واندی سے کہا کرتا تھا کہ میں اطبائے یونان کا منکر نہیں ہوں لیکن عرب کے اطباء بالکل بے حقیقت ہیں میں نے عرب کے اشعار پڑھے ہیں' ان کی شاعری سے بڑھ کر کوئی چیز مہمل رکیک اور ضرر رساں نہیں ہوسکتی۔ ہامرے بعض اطباء کہت ہیں کہا گر آج بقراط زندہ ہوتا تو اہل عرب کی تصنیفات کے ہوتے وئے کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔افسوس یہ کس قدر لغو بات ہے کیا ڈیما سیٹنس کے بعد سیر ومقرر نہُں ہوا۔کیا ہمر کے بعد درجل شاعر نہیں پیدا ہوا۔ کیا ہیر ڈوٹس کے بعد سالٹس نے تاریخ نویسی میں شریت عالم حاصل نہیں کی پھر یہ کیونکر مان لیا جائے کہ عرب کے بعد کوئی ہمسر نہ ہوگا جب کہ ہم اٹلی کے لوگ بہت سی باتوں

میں اٹلی کو تمام دنیا پر ترجیح دیتے ہیں تو کس قدر افسوس کی بات ہے کہ عرب کو ہم تمام دنیا سے افضل تر مان لیں۔

ایک دفعہ ایک شخص پیٹر یارک سے ملنے آیا' سلسلہ کلام میں پیٹر یارک نے پولوس کے کلام کی سند پیش کی اس شخص نے کہا کہ آپ کو اختیار ہے جس کو چاہیں اپنا استاد اور رہنما بنائیں لیکن ہمارے لیے صرف ابن رشد کافی ہے''۔ پیٹر یارک نے جواب دینا چاہا اس شخص نے کہا کہ مُں آپ کو منع نہیں کرتا آپ پکے عیسائی رہیں۔ لیکن مجھ کو ان خرافات سے معاف رکھیے۔ پولوس (پیغمبر) جس کا نام آپ عظمت سے لیتے ہیں ابن رشد کے آگے اس کی کیا حقیقت ہے۔ پیٹر یارک غصہ سے بے تاب ہو کر بولا اور اس کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ پیٹر یارک کے بعد پیڈوا کی یونیورسٹی میں جانڈن اس کا قائم مقام ہوا لیکن وہ ابن رشد کے فلسفہ کا بہت بڑا حامی تھا۔ یورپ نے اس کو سلطان الفلاسفۃ کا لقب دیا۔ جانڈن کے بعد پولوس نے اس کی جگہ لی۔ غرض پندرھویں صدی عیسوی کے ختم ہوتے ہوتے پیڈوا اور پولونیا کی یونیورسٹیوں میں ہر جگہ ابن رشد ہی ابن رشد تھا۔ لیکن ابن رشد کی عظمت کے چاند میں اب گہن لگنا شروع ہو گیا۔ بومبانا ایک شخص پیدا ہوا جس نے ابن رشد کے فلسفہ پر حملہ شروع کیا۔ ابن رشد اس بات کا قائل تھا کہ روح جسم کے فنا ہونے کے بعد قائم رہتی ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ ابدی چیز ہے۔ بومبونا نے اس مسئلہ کی مخالفت کی اور کہا کہ روح اور جسم ساتھ ساتھ فنا ہوتے ہیں البتہ چونکہ نوع انسانی ہمیشہ قائم رہے گی اس لیے اس لحاظ سے انسان کو غیر فانی کہہ سکتے ہیں۔

فلسفہ ارسطو کے مفسرین میں سب سے زیادہ نامور اسکندر فردوسی ایک شخص گزرا ہے ابن رشد بھی جا بجا اس سے اسناد کرتا ہے۔ اس کا یہی مذہب تھا کہ روح فانی چیز ہے۔ بومبونا کو ابن رشد کی مخالفت کی زیادہ تر جرات اسی وجہ سے ہوئی کہ خود ابن رشد کا معتقد علیہ

بقائے روح کا منکر ہے۔

بومبونا کی مخالفت نے دو گروہ پیدا کر دیے۔ ایک ابن رشد کا مخالف اور دوسرا موافق۔ یہ امر حیرت سے سننے کے قابل ہے کہ لاون جودسواں پوپ تھا اسی نے نیفوس ایک فلسفی عالم کو حکم دیا کہ بومبونا کا رد لکھے بظاہر تو اس سے پوپ کی نہایت روشن ضمیری ثابت ہوتی ہے لیکن اصل حقیقت ی ہے کہ ابن رشد کی تصنیفات میں فلسفہ کے ساتھ مذہب کا پہلو بھی ملحوظ تھا۔ بخلاف اس کے کہ بومبونا وغیرہ نے جن خیالات کا اظہار شروع کیا تھا دوسرے مذہب کی بنیاد ڈھائے دیتے تھے اور یہ اس ملحدانہ فلسفہ کا سنگ بنیاد تھا جس کی عمارت آج کل یورپ میں تکمیل کو پہنچ گئی ہے غرض نیفوس اور اشیلنی نے بومبونا کے رد میں بہت سی کتابیں لکھیں اور اٹلی کی تمام درس گاہوں میں یہ مباحث بڑے زور وشور سے پھیل گئے۔

بومبونا کا گروہ اسکندمین اور ابن رشد کا گروہ رشیدین کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ چونکہ یہ تحریک مذہب کے خلاف تھی اس لیے سنہ ۱۵۱۲ء میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس نے یہ قرار دیا کہ جو شخص بقائے روح کا منکر ہو وہ مردود ہے یہ بھی فیصلہ ہوا کہ جو لوگ ان خیالات کو پھیلاتے ہیں ان پر فرد قرارداد جرم قائم کی جائے اور عدالت میں ان کے اظہار لیے جائیں۔۔

سولھویں صدی عیسوی میں چرچ نے علانیہ ابن رشد کی حمایت شروع کی ہر طرف سے ابن رشد کی تصنیفات اور تراجم کی مانگ آنے لگی۔ لیکن چونکہ ابن رشد کی عظمت صرف اس حیثیت سے تھ کہ وہ فلسفہ ارسطو کا شارح ہے۔ اس لیے اب لوگوں کو ارسطو کی اصلی نصیفات اور تراجم کی مانگ آنے لگی لیکن چونکہ ابن رشج کی عظمت صرف اس حیثیت سے تھی کہ وہ فلسفہ ارسطو کا شارح ہ اس لیے اب لوگوں کو ارسطو کی اصلی تصنیفات کی طرف توجہ ہوئی اور یہ خیال پیدا ہوا کہ ارسطو کے اصلی مسائل عربی اور لاطینی قالب میں آتے آتے کچھ

سے کچھ ہو جاتے ہوں گے غرض اب اک نیا گروہ پیدا ہوا اور اس کا نام بھی اسی صفت سے مشہور ہوا۔ یعنی فرقہ جدیدیہ ۴ اپریل سنہ ۱۵۹۷ء میں پروفیسر ٹامس نے پیڈوا کی یونیورسٹی میں ارسو کی اصلی یونانی کتاب کو سامنے رکھ کر لیکچر دیا۔ اور یہ واقع اس قدر عظیم الشان سمجھا گیا کہ شعرا نے اس تقریب میں نظمیں لکھیں۔

اس جدید تحریک کا یہ نتیجہ ہوا کہ یا تو ابن رشد ارسطو کا قائم مقام سمجھا جاتا تھا یا وہ ارسطو کا حریف مقابل خیال کیا جانے لگا۔ چنانچہ فرقہ جدیدہ نے اپنے آپکو یونانی اور ابن رشد کے پیرو اپنے آپ کو رشدی کہتے تھے۔ یونانی تصنیفات کی مراجعت نے ایک اور انقلاب یہ پیدا کیا کہ اب تک ارسطو کے فلسفہ کے سوا کسی اور فلسفہ کے نام سے بھی آشنا نہ تھے لیکن اب ایک اور فرقہ پیدا ہوا جو افلاطون کا پیرو تھا۔ پیڈوا، بندقیہ اور اٹلی کے شمالی حصوں میں ارسطو کے اصلی فلسفہ کی تعلیم ہوتی تھی اور فلارنس میں افلاطون کا فلسفہ پڑھایا جاتا تھا غرض رفتہ رفتہ ابن رشد کے فلسفہ کا اثر بالکل جاتا رہا۔ سب سے آخری شخص جو ابن رشد کا پیرو تھا۔ قیصر کریموسنی تھا جس نے سنہ ۱۶۳۱ء میں وفات پائی۔

ابن رشد اور نہ صرف ابن رشد بلکہ عام طور پر یونانی اور قدیم فلسفہ کی اصلی بربادی بیکن کے ہاتھوں سے ہوئی جس کی تصنیفات سنہ ۱۵۹۷ء میں شائع ہوئیں۔ فلسفہ قدیم کی بنیاد قیاسات اور موہمات پر تھی۔ بیکن نے اس طریقہ کو بالکل ہیچ قرار دیا اور علمی عمارت کی بنیاد و مشاہدات و تجربات کی سطح پر قائم کی اس کا نتیجہ یہ ہے ک آج انسان نے تمام عالم کائنات پر قبضہ کرلیا ہے اور قدرت کے جو مخفی اسرار باقی رہ گئے تھے کوئی دم میں ان پر سے بھی پردہ اٹھا چاہتا ہے۔

ابن رشد کی تصنیفات اور اجتہادات پر ہم کبھی آئندہ ریویو کریں گے!۔

ے ا۔ اس مضمون کے متعدد ٹکڑے الندوہ اور معارف کے حسب ذیل نمبروں میں شائع ہوئے تھے اب ان ٹکڑوں کو مسلسل کر کے ایک مضمون بنالیا گیا ہے۔

(الندوہ جلد ا نمبر ۳، معارف جلد ۲ عدد ۱۲، الندوہ جلد ا نمبر ۷، الندوہ جلد ۳ نمبر ۶)

مجددان اسلام

علامہ ابن تمیمہ حرانی

اسلام میں سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں فضلا علما' مجتہدین' آئمہ فن' مدبرین ملک گزرے لیکن مجدد یعنی رفارمر بہت کم پیدا ہوئے۔ ایک حدیث ہے کہ ہر صدی میں ایک مجدد پیدا ہوگا'' اگر یہ مشتبہ حدیث مان لی جائے تو آج تک کم از کم تیرہ مجدد پیدا ہونے چاہئیں۔ لیکن اس حدیث کے صادق آنے کے لیے جن لوگوں کو مجددین کا لقب دیا گیا ہے ان میں سے اکثر معمولی درجہ کے لوگ ہیں۔ یہاں تک کہ علامہ سیوطی بھی اس منصب کے امیدوار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے مجدد کے رتبہ کا اندازہ نہیں کیا۔

مجدد یا رفارمر کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں:

۱۔ مذہب یا علم یا سیاست (پالٹکس) میں کوئی مفید انقلاب پیدا کردے۔

۲۔ جو خیال اس کے دل میں آیا ہو کسی کی تقلید سے نہ آیا ہو' بلکہ اجتہادی ہو۔

۳۔ جسمانی مصیبتیں اٹھائی ہوں' جان پر کھیلا ہو' سرفروشی کی ہو۔

یہ شرائط قدما میں بھی بہت کم پائے جاتے ہیں اور ہمارے زمانہ میں تو رفارمر ہونے کے لیے صرف یورپ کی تقلید کافی ہے۔

تیسری شرط اگر ضروری قرار نہ دی جائے تو امام ابوحنیفہ' امام غزالی' امام رازی' شاہ

ولی اللہ صاحب اس دائرہ میں آسکتے ہیں۔لیکن جو شخص رفارمر کا اصلی مصداق ہوسکتا ہے۔وہ علامہ ابن تمیمہ ہے ہم اس بات سے واقف ہیں کہ بہت سے امور میں امام غزالی وغیرہ کو ابن تمیمہ پر ترجیح ہے۔لیکن وہ امور مجددیت کے دائرے سے باہر ہیں۔مجددیت کی اصلی خصوصیتیں جس قدر علامہ کی ذات میں پائی جاتی ہیں اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔اس لیے ہم اس عنوان کے ذیل میں علامہ موصوف کے حالات اوران کی مجددیت کی خصوصیات لکھنا چاہتے ہیں۔

نام ونسب وولادت[1]

احمد نام' عرف ابن تمیمہ' تقی الدین لقب' سلسلہ نسب یہ ہے' احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام بن عبداللہ بن الخضر بن محمد بن الخضر بن علی بن عبداللہ بن تمیمہ الحرانی۔

دمشق کے علاقہ میں حران ایک مقام کا نام ہے ان کے آباؤ اجداد وہیں کے رہنے والے تھے۔ان کے دادا محمد بن خضر کی والدہ کا نام تمیمہ تھا۔

---

[1] علامہ ابن تیمیہ کے حالات اگر چہ کتابوں میں مذکور ہیں لیکن طبقات الحنابلہ میں ابن رجب حنبلی نے جو خود علامہ موصوف کے شاگرد ہیں ان کا حال زیادہ تفصیل سے لکھا ہے ذیل ابن خلکان اور طبقات الحفاظ میں بھی مفید حالات ہیں۔حافظ ابن حجر نے درکامنہ میں نہایت دلچسپ اور مفید حالات لکھے ہیں۔لیکن میرے پاس اس کتاب کا جو نسخہ تھا نہایت غلط تھا اس لیے اکثر جگہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔

وہ نہایت قابل تھیں اور وعظ کیا کرتی تھیں۔ علامہ موصوف نے ان ہی کی طرف منسوب ہوکر ابن تیمیہ کے نام سے مشہور ہیں۔علامہ کے خاندان میں ساتھ آٹھ پشت سے درس و تدریس کا مشغلہ چلا آ تا ہے۔اور سب لوگ علم وفن میں ں ممتاز گزرے۔علامہ کے والد عبدالحلیم بہت بڑے عالم تھے۔فن حدیث میں انکو کمال حاصل تھا۔

علامہ موصوف دوشنبہ کے دن ۱۰ ربیع الاول سنہ ۶۶۱ ھ میں بمقام حران پیدا ہوء۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ تاتاری بغداد کو غارت کر کے شام کی طرف پھیل رہے تھے اور جدھر جاتے تھے ملک کے ملک برباد کرتے چلے جاتے تھے۔علامہ کے والد اسی پریشانی میں رات کو چھپ کر تمام خاندان کے ساتھ حران سے نکلے الگ الگ سواری کا بندوبست نہ تھا' سب کے سب ای گاڑی مُں بیٹھے کتابیں بھی اسی گاڑی میں رکھیں تاتاری بھی تعاقب میں تھے لیکن خدانے بچالیا اور گرتے پڑتے دمشق پہنچ گئے۔ یہ سنہ ۶۶۷ ء کا واقعہ ہے۔اس وقت علامہ کی عمر ۶ برس ک ی تھی۔علامہ نے والد کے اشارہ سے دمشق میں علم کی تحصیل شروع کی۔دس برس کی عمر ہونےنہُں پائی تھی کہ نحو' صرف' ادب وغیرہ سے فراغت حاصل کی اور ۱۷ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے فتوے دینے کے قابل ہو گئے۔تصنیف و تالیف بھی اسی عمر میں شروع ہوگئی۔۲۱ برس کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔وہ متعدد مدارس میں مدرس تھے ۔ان کے بعد ان تمام مدرسوں میں باپ کا عہدہ ان کو ملا۔

علامہ موصوف نے جن اساتذہ سے علوم کی تحصیل کی ان کی تعداد ۲۰۰ تک پہنچتی ہے جن میں سے مشاہیر کے نام یہ ہیں ابن ابی الیسر' کمال بن عبد' شمس الدین حنبلی' قاضی شمس الدین ابن عطاء الحنفی' شیخ جمال الدین بن صیرنی' مجد الدین بن عساکر' یحیب مقداد' ابن ابی الخیر' ابن علان ابوبکر ہروی' کمال عبدالرحیم فخر الدین بن البخاری' ابن شیبان' شرف بن القواس۔

یہ بات یاد رکھنے کے قاب ہے کہ ان کے اساتزہ میں زینب بھی ہیں جو ایک فاضل خاتون تھیں سنہ ۶۸۱ ھ میں دار الحدیث سکریہ میں جو خاص فن حدیث کا درس گاہ تھا پہلا درس دیا۔ اس درس میں بڑے بڑے علماء اور فضلاء استفادہ کی غرض سے شریک ہوئے۔ چنانچہ قاضی القضاۃ بہاء الدین، شیخ تاج الدین فزاری، زین الدین بن مرجل، شیخ زین الدین ابن منجا تک شریک تھے۔ علاہ نے یہ صرف بسم اللہ کے متعلق اس قدر نکات اور دقائق بیان کیے کہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ تاج الدین فزاری نے یہ تقریر حرف بحرف قلمبند کی ہے۔ اسی زمانہ میں جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد قرآن مجید کی تفسیر پر ابتدا سے بہ ترتیب درس دینا شروع کیا۔ یہ درس اس قدر مفصل اور بسبیط ہوتا تھا کہ سورہ نوح کی تفسیر کئی برس میں تمام ہوئی۔

ان کے علم و فضل کا شہرہ اس قدر عام ہوتا جاتا تھا کہ سنہ ۶۹۰ ھ سے پہلے پہلے یعنی جب ان کی عمر ۳۰ برس کو بھی نہ پہنچی تھی قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا گیا لیکنا نہوں نے انکار کر دیا ۲ سنہ ۶۹۱ ھ میں حج کو گئے اور جب واپس آئے تو تمام ملک میں انکے فضل و کمال کا سکہ جم چکا تھا۔ لیکن اس حسن قبول کے ساتھ مخالفت کا سامان بھی جمع ہوتا جاتا تھا۔ اسلامی فرقوں میں سے اشعری اور حنبلی آپس میں حریف مقابل تھے۔

امام رازی نے اشاعرہ مذہب کو اس قدر مدلل اور روشن کر دیا تھا کہ حنبلی مذہب گویا بجھ چکا تھا۔ علامہ ابن تیمیہ حنبلی تھے اور ان کے نزدیک

۱۔ طبقات الحنابلہ ان رجب ۲۔ طبقات الحنابلہ ابن رجب

حنبلیوں ہی کی رائے صحیح تھی۔ اس لیے انہوں نے دلیری سے ان خیالات کا اظہار

کیا۔سنہ ۶۹۸ھ میں ؎۱ ایک استفتا ان کے پاس اس کے متعلق آیا۔انہوں نے دو تین گھنٹہ میں اس کا لمبا چوڑا جواب لکھا جو حمویہ کے نام سے مشہور ہے۔اس میں نہایت تفصیل سے اشعریوں کی غلطی ثابت کی۔ یہ پہلا دن تھا کہ ان کی عداوت اور مخالفت کی صدا بلند ہوئی فقہا نے ان سے جا کر بحث کی لیکن قاضی امام الدین قزوینی ان کے طرف دار ہو گئے اور کہا کہ جو شخص علامہ کے مخالف کوئی بات کہے گا میں اس کو سزا دوں گا۔شورش ؎۲ یہاں تک پہنچی کہ قاضی حنفی نے منادی کرادی کہ ابن تیمیہ فتویٰ نہ دینے پائیں۔لیکن حکام میں سے ایک صاحب اثر نے علامہ کی طرفداری کی اور وہ فتنہ فرو ہو گیا۔ ؎۳

سنہ ۷۰۵ھ میں یہ فتنہ پھر سے زور شور سے اٹھا۔ یہاں تک کہ شاہی حکم آیا کہ نائب السلطنت افرم علماء و فضلاء کے مجمع میں علامہ کا اظہار لیں۔غرض سنہ ۷۰۵ھ کو تمام قضاۃ اور علماء ایوان شاہی میں جمع ہوئے اور علامہ کو بلوا بھیجا۔ وہ اپنی تصنیف ''عقیدہ واسطیہ'' ہاتھ مُں لے کر آئے اور اس کو پڑھ کر سنایا۔ تین جلسوں میں پوری کتاب ختم ہوئی پھر ۲ صفر سنہ ۷۰۵ھ کو مناظرہ کی مجلس منعقد ہوئی اور علامہ صفی الدین ہندی افسر مناظرہ مقرر ہوئے پھر کسی وجہ سے ان کے بجائے کمال زملکانی جو مشہور محدث تھے اس خدمت پر مامور ہوئے۔ بالآخر سب نے تسلیم کیا کہ علامہ کے عقائد اہل سنت کے عقائد ہیں۔ چندروز کے بعد شاہی فرمان آیا کہ علامہ پر جو الزام لگائے

؎۱۔ فوات الوفیات ؎۲۔ درد کامنہ حالات ابن تیمیہ ؎۳۔ طبقات الحنابلہ ابن رجب

گئے تھے غلط تھے۔ حافظ ابن حجر نے درد کامنہ میں لکھا ہے کہ علامہ نے اقرار کیا کہ

میرے عقائد امام شافعی کے عقائد ہیں۔

۱۲ رجب سنہ ۷۰۵ھ کو علامہ مزی نے بخاری کی کتاب افعال العباد کا درس جامع مسجد میں دیا اس پر بعض شافعیوں کو خیال ہوا کہ اس کا روئے سخن ہماری طرف ہے۔ چنانچہ قاضی شافعی سے جا کر شکایت کی اقاضی نے الٹا اسی کو قید کر دیا۔ علامہ ابن تیمیہ کو خبر ہوئی تو خود گئے اور بزور اس کو قید خانے سے چھڑا لائے۔ قاضی یہ سن کر قلعہ میں گئے کہ نائب السلطنت سے اس کی شکایت کریں۔ اتفاق سے علامہ بھی وہیں موجود تھے روبرو گفتگو ہوئی اور سخت کلامی تک نوبت پہنچی۔ بالآخر نائب السلطنت نے رفع فساد کے لیے منادی کرادی کہ جو شخص ان عقائد کا اظہار کرے گا اس کو سزا دی جائے گی۔[1]

چند روز کے بعد یہ فتنہ پھر اٹھا امرائے دربار میں سے بیرس چاشگیر کی حکومت کا دایاں ہاتھ تھا اور وہ شیخ نصر منجی کا نہایت معتقد تھا۔ شیخ نصر علامہ ابن تیمیہ اور ان کے عقائد کے سخت مخالف تھے یہاں تک کہ بعض لوگوں کو اس جرم پر قتل بھی کرا چکے تھے۔ انہوں نے بیرس کو آمادہ کر لیا ک علامہ دمشق سے قاہرہ طلب کیے جائیں۔ چنانچہ ۲۱ رمضان سنہ ۷۰۵ھ کو علامہ ڈاک میں بیٹھ کر دمشق سے قاہرہ میں آئے اور اس کے دوسرے دن قلعہ میں دربار عام ہوا۔ قاضی ابن مخلوق مالکی حکم ہو کر بیٹھے ایک شخص جس کا نام ابن عدلان تھا اس نے اظہار دیا کہ ابن تیمیہ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا حرف اور الفاظ کے ذریعہ سے بولتا ہے اور اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ کہہ کر اس نے قاجی ابن مخلوق کی طرف دیکھا کہ کیا ایسا شخص قتل کا مستحق

---

[1] یہ واقعات صرف درد کامنہ میں ہیں۔

نہیں ہے۔ قاضی صاحب نے علامہ کی طرف خطاب کیا علامہ نے خطبہ (لکچر) کے طریقہ رپ جواب دینا چاہا اس لیے پہلے حمد وثنا شروع کی۔ قاضی نے کہا کہ جلد جواب دو علامہ بولے کہ کیا حمد وثنا نہ کروں؟ قاضی نے کہا کہ اچھا وہ ابھی ہو چکی اب تو جواب دو علامہ چپ ہو رہے جب زیادہ اصرار ہوا تو انہوں نے کہا کہ حکم کون ہے؟ لوگوں نے قاضی صاحب کی طرف اشارہ کیا چونکہ وہ اشعری تھے علامہ نے کہا کہ یہ خود فریق مقدمہ ہیں حکم کیونکر ہو سکتے ہیں ل۔ اس پر لوگ برہم ہوئے اور علامہ کو مجلس سے اٹھا دیا۔ علامہ کے بھائی شیخ شرف الدین بھی اس معرکہ میں موجود تھے۔ وہ بھی علامہ کے ساتھ اٹھے اور ان کے منہ سے بد عا نکلی علامہ نے روکا اور کہا کہ یوں کہوں اللھم اھدھم۔

غرض قاضی مالکی کے حکم سے علامہ قلعہ کے قید خانہ میں بھیج دیے گئے۔ لیکن جب قاضی کو معلوم ہوا کہ یہاں کسی کی روک ٹوک نہیں لوگ علامہ سے بے تکلف ملتے جلتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ابن تیمیہ کا کفر ثابت ہو چکا ہے۔ اس لیے فرض تو یہی تھا کہ وہ قتل کر دیے جائیں لیکن کم از کم قید خانے کی سختی تو ضروری ہے۔ غرض عید کے دن قلعہ سے منتقل ہو کر جب یوسف جو نہایت تاریک قید خانہ ہے قید کیے گئے۔ اسی زمانہ میں شاہی فرمان نافذ ہوا کہ جو شخص ابن تیمیہ کا ہم خیال ہو گا قتل کر دیا جائے گا۔ یہ فرمان ابن شہاب محمود نے جامع مسجد میں جا کر پڑھا۔ حنبلی فرقہ کے لوگ ہر جگہ سے گرفتار ہو کر آئے اور ان سے یہ اقرار لیا گیا کہ وہ شافعی العقیدہ ا ہیں۔ قاہرہ میں حنبلیوں کو طرح طرح کی سزائیں دی گئیں کہ وہ ابن تیمیہ کے عقیدہ سے باز آئیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس عام آشوب میں علامہ کی جس نے حمایت کی

ل۔ درد کا منہ

وہ شمس الدین ابن الحویری تھے جو مذہباً حنفی تھے۔ انہوں نے ایک محضر لکھا جس میں یہ عبارت لکھی کہ تین سو برس سے ابن تیمیہ کا کوئی ہمسر نہیں پیدا ہوا۔ اس جرم میں شمس الدین کی معزولی کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ وہ اگلے سال معزول کر دیے گئے۔[1]

اتفاق یہ کہ سالار جو سلطان ناصر کا دست و بازو تھا علامہ کی حمایت پر آمادہ ہوا۔ اس نے تینوں مذہب کے فقہاء کو جمع کیا اور خواہش کی کہ علامہ قید سے رہا کر دیے جائیں۔ سب نے بالاتفاق فیصلہ کیا کہ اگر وہ چند شرائط قبول کریں اور بعض عقائد سے باز آئیں تو البتہ ان کی رہائی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ان شرائط کے قبول کرنے کے لیے علامہ طلب کیے گئے لیکن وہ نہ آئے بار بار ان کو پیغام بھیجا گیا لیکن ان کو خیال کی آزادی کے مقابلہ میں اپنا قید ہونا گوارا تھا۔[2]

اس زمانہ کے واقعات کے متعلق ایک تحریر خود علامہ کی ہماری نظر سے گزری ہے اس کا نام مناظرہ مصریہ ہے۔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ سنہ ۷۰۶ھ میں دو شاہی عہدہ دار میرے پاس آئے کہ چل کر علماء کے سامنے اپنے عقائد کا ثبوت بیان کیجیے۔ میں نے کہا کہ سال بھر سے تم لوگ میرے خلاف لوگوں کے بیان سنتے رہے اور کبھی مجھ کو جواب کا موقع نہیں دیا۔ اب ایک دفعہ تنہا میرا بیان بھی سن لو پھر مجمع عام میں گفتگو ہوگی۔ دونوں عہدہ دار واپس گئے اور یہ پیغام لائے کہ آپ کو مجبوراً چلنا ہوگا۔ میں نے انکار کیا کہ وہ لوگ واپس گئے اور پھر یہ پیغام لائے کہ فلاں فلاں عقیدوں سے باز آؤ۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے اس کے جواب میں یہ رسالہ لکھا۔

لطیفہ جن دنوں علامہ قید میں تھے باہر کے ایک رئیس نے علامہ کی صورت کا ایک آدمی دیکھا، متعجب ہو کر پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ اس نے کہا

ے ا۔ دردکامنہ ے ۲ طبقات ودردکامنہ

ابن تیمیہ ۔ رئیس کونہایت تعجب ہوا۔ اس نے ماردین کے رئیس کو اس واقعہ کی اطلاع دی رئیس ماردین نے بادشاہ مصر کولکھا لوگوں کونہایت حیرت ہوئی علامہ نے اس واقعہ کوایک ضمنی موقع پر رسالہ الفرقان میں لکھا ہےا۔اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ غالباً جن تھا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ کی عظمت و شان نے اس رئیس کے دل میں ایک خیالی صورت پیدا کی جو مجسم ہو کر نظر آئی۔جن کا خیال علامہ کی وہم پرستی ہے۔(جن کے وجود سے انکار نہیں، لیکن جن یوں صورت بدل کر لوگوں کے پاس آیا جایا نہیں کرتے)۔

غرض ڈیڑھ برس تک علامہ قید خانہ میں رہے ان کے بھائی بھی ساتھ تھے۔معمول تھا کہ قیدیوں کو کھانا کپڑا حکومت کی طرف سے ملتا تھا۔لیکن علامہ نے عطیہ سلطانی سے بالکل انکار کیا اور فقر و فاقہ سے بسر کی ے۲

ربیع الاول سنہ ۷۰۷ھ میں مہنا بن عیسیٰ جو عرب کا مشہور رئیس تھا مصر میں آیا اور خود قید خانہ میں جا کر علامہ کو چھڑا لایا۔اس کے بعد متعدد جلسے منعقد کیے گئے اور تمام علماء و فضلا کو جمع کیا جس میں علامہ نے مسائل متنازعہ پر گفتگو کی۔صاحب طبقات نے علامہ ذہبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ علامہ نے قتل کے ڈر سے بعض مسائل میں اتفاق کیا۔لیکن صاحب و فیات نے جو علامہ کا شاگرد ہے لکھا ہے کہ علامہ نے حریفوں کو زور استدلال سے مغلوب کر لیا۔بہرحال علامہ قید خانہ سے نکل کر درس و تدریس میں مشغول ہوئے اور چند روز کے لیے ان کو اطمینان نصیب ہوا۔

سلسلہ سخن کے اتصال سے ہم بہت دور نکل آئے اور بیچ کے اہم واقعات جن میں

علامہ نے ملکی معاملات انجام دیے چھوٹ گئے۔ علامہ موصوف عام علماء کی طرح اپنا فرض صرف نماز، روزہ ادا کرنا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کے

۱۔ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۷ ۲۔ طبقات الحنابلہ

نزدیک مہمات سیاست میں دخل دینا بھی علماء کے فرائض میں داخل تھا۔ سنہ ۶۷۸ھ میں جب ان کی عمر ۱۸۔۱۹ سال کی تھی غازان خا بن ہلاکو کان نے شام پر حملہ کیا سلطان ناصر (بادشاہ مصر) اس کے مقابلہ کو نکلا لیکن بڑے معرکہ کے بعد شکست کھائی غازان خاننے آگے بڑھ کر حمص پر قبضہ کرلیا۔ اس کی آمد آمد کی خبر سن کر دمشق میں اس قدر برہمی پھیلی کہ عام غارت گری شروع ہوگئی۔ علامہ ابن تیمیہ یہ حالت دیکھ کر خود غازان خان کے پاس گئے اور اس سے امن کا فرمان لے آئے۔ عام لوگ یہ سن کر مطمئن ہوگئے لیکن اہل فوج نے نہ مانا اور شہر کو لوٹنا شروع کر دیا۔ علامہ ابن تیمیہ نے شیخ الشیوخ نظام الدین محمود کو لے کر شہر کا بندوبست اور امن و امان قائم کیا پھر غازان سے جا کر ملاقات کی۔ اس کے بعد تاتاری فوجیں بیت المقدس وغیرہ کی طرف بڑھیں اور ہزاروں آدمی گرفتار کر کے علامہ سردار لشکر کے پاس گئے اور بہت سے قیدیوں کو چھڑا لائے۔[۱]

سنہ ۶۹۹ھ میں غازان خان نے بڑے زور وشور سے شام کے حملہ کی تیاری کی قتلو شاہ وارتو لائے جو اس کے سپہ سالار تھے فوجیں لے کر آگے بڑھے۔ یہ خبر سن کر علامہ ابن تیمی نے جا کر ان سے گفتگو کی اور ان کو اس ارادے سے روکا ساتھ ہی جہاد کا سامان کیا اور ہر قسم کی تیاریاں شروع کیں۔ اس وقت تو یہ فتنہ فرو ہو گیا لیکن سال بھر کے اندر پھر تاتاریوں کا سیلاب امنڈا اور ہر طرف تاتاری فوجیں پھیل گئیں۔ علامہ ڈاک میں بیٹھ کر مصر پہنچے اور

اعیان سلطنت سے مل کر ان کو جہاد کی ترغیب دی۔ تمام شہران سے ملنے کے لیے آیا۔ یہاں تک کہ علامہ تقی الدین بن دقیق العید جو امام المحدثین اور قاضی القضاۃ تھے وہ بھی تشریف لائے۔ مصر کے لوگوں کو آمادہ کر کے علامہ دمشق کو واپس گئے اور جہاد کی تیاریاں کیں۔[2]

---

[1] یہ تمام واقعات تاریخ ابن خلدون میں مذکور ہیں جلد ۵ ذکر السلطنت اتراک مصر

[2] فوات الوفیات

سنہ ۷۰۲ھ میں تاتاریوں نے پھر نہایت سروسامان سے شام پر چڑھائی کی قتلو شاہ اور چوپان جو سردار فوج تھے نوے ہزار فوج لے کر بڑھے۔ اس وقت شام سلطان ناصر کے قبضہ میں تھا۔ اس کو خبر ہوئی تو نہایت گھبرایا ارکان دربار نے بھی ہمت ہار دی۔ علامہ ابن تیمیہ یہ حالات سن کر ڈاک میں شام سے مصر پہنچے اور بادشاہ سے مل کر نہایت بیباکی سے اس کو غیرت دلائی اور کہا کہ اگر تم اسلام کی حمایت نہ کرو گے تو خدا کسی اور کو بھیجے گا جو اس فرض کو انجام دے گا۔ اس کے بعد علامہ نے قرآن مجید کی یہ آیتیں پڑھیں۔

وان یتولوا لیتدل قوما غیر کم ثم ا یکونا ا امثالکم

''اگر تم پیٹھ دکھاؤ گے تو خدا تمہارے بدلے اور قوم بھیجے گا۔

اور وہ تمہاری طرح (بزدل) نہ ہوں گے۔''

علامہ نے جس دلیری اور بے باکی سے بادشاہ سے گفتگو کی تمام لوگوں کو حیرت ہوئی۔ امام تقی الدین ابن دقیق العید کو بھی ان کی جرات اور لطف استنباط پر حیرت ہوئی۔[1]

علامہ کو اس سفارت میں پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ سلطان ناصر شام کی طرف بڑھا اور مرج الصغر میں شقحب ہے دونوں فوجیں معرکہ آراء ہوئیں۔ بڑے زور زور کا رن

پڑا۔ بالآخر تاتاریوں کی فوجیں برباد ہوگئیں۔ ابن تیمیہ اس معرکہ میں علامہ کے بجائے ایک بہادر سپاہی نظر آئے۔

غازان خان اور امرائے تاتار کی سفارتوں میں علامہ نے جس آزادی سے دلیری سے سفارت کی خدمت انجام دی اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک دفعہ جب وہ سپہ سالار قتلو خان کے پاس ایک شخص کی دادرسی کے لیے گئے

۱۔ ابن خلدون اور طبقات الحنابلہ

تو قتلو خان نے استہزا کے طور پر کہا کہ آپ نے کیوں تکلیف کی آپ نے بلا بھیجا ہوتا۔ میں خود حاضر ہو جاتا۔ علامہ نے کہا کہ نہیں حضرت موسیٰ فرعون کے پاس جاتے تھے فرعون حضرت موسیٰ کے پاس نہیں آتا تھا۔[۱]

علامہ موصوف نے شیخ محی الدین اکبرو کے متعلق متعدد رسالوں میں لکھا تھا کہ وہ وحدت وجود کے قائل ہیں یعنی خدا اور مخلوقات سب ایک ہیں۔ اور یہ مذہب اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس پر صوفیوں کے گروہ نے حاکم شافعی سے جا کر شکایت کی۔ اس کے فیصلہ کے لیے ایک مجلس منعقد ہوئی۔ علامہ پر جو الزامات لگائے گئے تھے وہ غلط ثابت ہوئے لیکن علامہ نے یہ تسلیم کیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کرنے کا ناجائز سمجھتا ہوں۔ اس پر لوگوں میں اختلاف رائے پیدا ہوا۔ بعض کہتے تھے کہ اس میں کیا حرج ہے۔ لیکن حاکم بن جماعہ نے کہا کہ یہ خلاف ادب ہے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ مقدمہ قاضی کے پاس بھیج دیا جائے اور وہ احکام شریعت کے موافق فیصلہ کردیں۔ آخر سلطنت کی طرف سے یہ حکم صادر ہوا کہ علامہ کے سامنے دو باتیں پیش کی جائیں یا تو چند شرائط کے ساتھ چھوڑ دیے

جائیں یا اگر شرائط کے قبول کرنے سے انکار ہو تو قید خانہ گوارا کریں۔

علامہ نے قید خانہ قبول کیا۔ لیکن ان کے احباب نے جو دمشق سے ان کے ساتھ آئے تھے اپنی طرف سے ذمہ داری لی کہ علامہ کو وہ شرطیں منظور ہیں اس بنا پر دمشق جانے کی اجازت ملی اور علامہ ڈاک میں روانہ ہوئے۔ لیکن دوسرے دن پھر واپس آنا پڑا۔ اور امراء اور قضاۃ نے پھر ایک مجمع کیا۔ مختلف لوگ رائیں دیتے تھے۔ بعض نے قید کی رائے دی۔ قاضی مالکی نے کہا

ا۔ فوات الوفیات

ان پر کوئی جرم ثابت نہیں ہے۔ نور الدین زوادی سے لوگوں نے پوچھا تو متحیر ہوئے کہ کیا جواب دیں۔ علامہ نے دیکھا ہ ان کی وجہ سے لوگوں میں اختلاف آراء ہوتا ہے بولے کہ میں خود قید خانہ میں جاتا ہوں۔ زدادی نے کہا کہ اگر قید خانہ میں بھیجے جائیں تو وہاں ان کی شان کے مناسب ان سے برتاؤ کیا جائے لیکن اوروں نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ سلطنت اس کو منظور نہیں کر سکتی۔ قید خانہ میں عام قیدیوں کی طرح رہنا ہوگا۔ غرض قید خانہ میں بھیجے گئے لیکن احترام قائم رہا۔ خدام کو ان کے ساتھ رہنے کی اجازت دی گئی ہر شخص ان کے پاس آن جانے کا مجاز تھا۔ چنانچہ مشکل سے مشکل فتوے لے کر لوگ آتے تھے اور علامہ ان کے جواب لکھتے تھے۔ اکثر لوگ برکت کی غرض سے ملنے جاتے تھے۔ خاص ان کے یاران صحبت کو بھی آزادی حاصل تھی بے تکلف ان سے مل سکتے تھے۔[1]

سلطان مظفر کی چند روزہ [2] سلطنت میں قاہرہ سے اسکندریہ بھیج دیے گئے۔ اور ایک وسیع خوش منظر برج میں نظر بند کیے گئے لیکن یہاں بھی ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔

نہانے کے لیے حمام میں بھی جا سکتے تھے۔ جب دوبارہ سلطان ناصر کو غلبہ حاصل ہوا اور سلطان مظفر قتل کر دیا گیا تو سلطان نے حکم دیا کہ علامہ نہایت عزت و احترام سے قاہرہ بلائے جائیں چنانچہ سنہ ۷۰۹ھ میں علامہ نہایت احترام کے ساتھ قاہرہ میں آئے۔ سلطان نے دربار میں بلایا اور جب وہ آئے تو کھڑے ہو کر تعظیم دی۔

سلطان نے مجمع عام میں علامہ کی نہایت تعریب کی جس سے غرض یہ تھی کہ

۱؎ طبقات ابن رجب ۲؎ دررکامنہ میں لکھا ہے کہ قاضی زین بن مخلوق نے ان کو نائب السلطنت سے کہہ کر اسکندریہ کے قید خانہ میں بھجوایا تھا کہ کوئی ان سے ملنے نہ پائے لیکن لطف یہ کہ قاضی صاحب نے یہ حکم بھجوایا تھا تو مرض الموت میں گرفتار تھے حسن خاتمہ بغیر اس کے کیونکر ہو سکتا تھا۔

لوگ ان کی مخالفت سے باز آئیں۔ سلطان نے بھی یہ ارادہ کیا کہ علامہ کے مخالفوں کو سزا دلائے چنانچہ خود علامہ سے مشورہ کیا لیکن انہوں نے باز رکھا۔ ابن مخلوق جو علامہ کے قتل کے درپے تھے اس موقع پر موجود تھے۔ علامہ نے ان سے بھی درگزر کی چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں ابن تیمیہ جیسا جوانمرد نہیں دیکھا۔ میں نے ان کے قتل کی کوشش کی لیکن جب مجھ پر ان کو قابو ملا تو معاف کر دیا۔۱؎

مہینہ بھر کے بعد سلطان نے پھر علامہ کو طلب کیا اور ان سے ملاقات کی۔ سلطان کے حسن عقیدت کی وجہ سے علامہ کا آستانہ مرجع عام بن گیا۔ امراء اہل فوج، درباری سب آتے تھے اور نہایت عزت و احترام سے ملتے تھے۔ لیکن بعضوں کو اس قدر عناد تھا کہ اس حالت میں بھی شرارت سے باز نہ آتے تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ فقیہ بکری تھے

انہوں نے ایک دن علامہ کو اکیلا پا کر گریبان پکڑ لیا۔ اور کہا کہ عدالت میں چلو مجھ کو تم پر استغاثہ کرنا ہے۔ زیادہ شور وغل ہوا تو ادھر ادھر سے لوگ جمع ہو گئے۔ فقیہ صاحب بھاگ نکلے۔ اتفاق یہ کہ ایک مدت کے بعد کسی بات پر سلطان ان سے ناراض ہوا اور حکم دیا کہ ان کی زبان کٹوا دی جائے علامہ کو خبر ہوئی تو سلطان سے سفارش کی اور اتنی بات پر معاملہ ٹل گیا کہ وہ فتوے نہ دینے پائیں۔

سنہ ۷۱۲ھ میں سلطان تاتاریوں کے مقابلہ کے لیے شام کو روانہ ہوا علامہ بھی جہاد کی غرض سے ساتھ ہوئے اور عسقلان تک ساتھ ساتھ آئے۔ یہاں سے بیت المقدس کی زیارت کے لیے گئے۔ زیارت سے فارغ ہو کر سات برس کے بعد دمشق میں آئے۔ ان کے بھائی اور اکثر شاگرد بھی ساتھ تھے۔ شہر کے لوگوں کو خبر ہوئی کہ تمام شہر امنڈ آیا۔ بڑی دھوم دھام سے شہر میں داخل ہوئے۔

۱؎ طبقات

اور جن مدارس میں درس دیتے تھے وہاں درس دینا شروع کیا۔

سنہ ۷۱۸ھ ۱؎ میں علامہ نے خلف طلاق کے متعلق جمہور فقہا کے مخالف رائے ظاہر کی۔ اس پر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے حکام سے شایت کی اور امن وامان قائم رکھنے کی غرض سے بادشاہی فرمان صادر ہوا کہ علامہ فتویٰ نہ دینے پائیں۔ شہر میں اس کی عام منادی کرا دی گئی۔ لیکن علامہ نے کہا کہ حق کا چھپانا جائز نہیں۔ چنانچہ وہ عام طور پر فتویٰ دیتے رہے۔ بالآخر سلطان کے حکم سے قید کیے گئے اور قلعہ میں بھیج دیے گئے۔ ۵ مہینے کے بعد ۷۲۱ھ میں ہائی ملی اور بدستور پڑھانے میں مشغول ہوئے۔

لیکن جو عام ناراضی پھیل چکی تھی اس کی آگ رہ رہ کر سلگتی اور بھڑکتی رہی۔ بیس برس پہلے علامہ نے ایک فتویٰ لکھا کہ صرف زیارت کے ارادہ سے مدینہ منورہ کا سفر کرنا شرعاً ثابت نہیں۔ یہ فتویٰ ایک فتنہ خوابیدہ تھا۔ جس کو موقع پا کر لوگوں نے جگایا اور تمام ہشر میں آگ سی لگ گئی۔ اٹھارہ بڑے بڑے فقہاء نے علامہ کے کفر کا فتویٰ دیا جن کے سرکردہ قاضی اخنائی مالکی تھے۔ چاروں مذہب یعنی حنفی، مالکی، حنبلی اور شافعی فقہا سے فتویٰ لیا گیا سب نے بالآخر اتفاق سے علامہ کی قید کا فتویٰ دیا۔[۱] چنانچہ شعبان ۷۲۶ھ میں شاہی فرمان کی رو سے وہ دمشق کے قلعہ میں قید کر دیے گئے۔ ان کے بھائی شرف الدین پر اگرچہ جرم نہ تھا، لیکن ان کی عت نے گوارا نہ کیا کہ بھائی کو تنہا چھوڑ دیں، اپنی خوش سے قید خانے مُس گئے۔ ۱۴ جمادی الاولیٰ کو قید خانہ ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے جنازہ کی نماز قلعہ سے باہر پڑھی گئی۔ لیکن علامہ کو اس میں شرکت کا موقع نہ دیا گیا۔ مجبوراً علاہ نے قید ہی کی حالت میں قلعہ کے اندر نماز ادا کی۔ چونکہ تکبیر کی آواز اندر تک

---

[۱] دررکامنہ میں حافظ ابن حجر نے اس کو سنہ ۷۱۹ کا واقعہ بتایا ہے۔ [۲] طبقات

آتی تھی اس لیے نماز کے ارکان میں فرق نہ آیا۔ لیکن بھائی کا بھائی کے جنازہ میں نہ شریک ہو سکنے پر سب کو رقت ہوئی اور لوگ بہت روئے۔[۱]

قید کی حالت میں بھی علامہ کا پاس ادب ملحوظ رکھا گیا۔ ان کے رہنے کو بہت اچھا کمرہ دیا گیا۔ کمرہ ہی میں پانی کا انتظام بھی تھا خدمت کے لیے ایک وفادار موجود تھا۔ علامہ نے یہاں نہایت اطمینان سے تصنیف و تالیف شروع کی۔ قرآن مجید کے حقائق پر بہت کچھ لکھا۔ کہا کرتے تھے افسوس ہے کہ جو نکات اور حقائق خدا نے القا کیے کبھی نہیں کیے گئے

تھے۔ افسوس ہے کہ قرآن مجید کے سوا میں نے اپنی زندگی ااور تصنیفات میں کیوں صرف کی۔ جس مسئلہ پر علامہ کو سزا ملی تھی اس کے متعلق علامہ نے نہایت مفصل مضامین لکھے۔ احباب اور اہل فتوی کو خطوط اور فتوے بھی لکھتے رہے۔ یہ تحریریں ملک بھر میں پھیلیں تو رفع فساد کے لیے حکم دیا گیا کہ علامہ کے پاس قلم و دوات وغیرہ کی کوئی چیز نہ جانے پائے۔ اس کے بعد علامہ نے جو سب سے اخیر تحریر لکھی وہ چند سطریں تھیں۔ جن کا مضمون تھا کہ اگر اصلی سزا دی گئی تو وہ صرف یہی ہے کہ یہ سطریں علامہ نے کوئلے سے لکھی تھیں۔

اب علامہ ہمہ تن ذکر و عبادت' تلاوت قرآن' مجاہدہ اور ریاضت میں مشغول ہوئے۔ بالآخر بیمار ہوئے اور بیس دن بیمار رہ کر دوشنبہ کی رات ذوقعدہ سنہ ۲۸ ۷ ھ میں وہ آفتاب علم دنیا کے افق سے چھپ گیا اور تمام عالم میں تاریکی چھا گئی۔

رفتم واز رفتن ن عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چو رفتم ' بزم برہم ساختم

علامہ کی زندگی تک تو زمین اور آسمان ان کے دشمن تھے لیکن جب ان کے مرنے کی خبر پھیلی تو تمام ملک پر سناٹا چھا گیا۔ موذن نے جامع مسجد کے مینار

۱؎ طبقات ذکر عبداللہ بن عبدالحلیم شرف الدین

پر چڑھ کر اعلان دیا۔ پولیس والوں نے برجوں میں منادی کرا دی کہ دفعتہً تمام دکانیں بند ہو گئیں۔ نائب الحکومت کے پاس جا کر لوگوں نے تعزیت کی رسم ادا کی۔ آئمہ محدثین امام مزی وغیرہ نے غسل دیا۔ قلعہ میں کثرت کی وجہ سے تل دھرنے کو جگہ نہیں رہی۔ قلعہ سے لے کر جامع مسجد تک آدمیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی شہر کا شہر امنڈ آیا تھا۔ جامع مسجد

سے قلع تک ٹھٹ لگ گیا جنازہ جامع مسجد لا کر رکھا گیا۔ ہجوم اور کشمشک سے بچانے کے لیے ہر طرف فوجیں متعین کی گئیں۔ سب سے پہلے قلعہ میں شیخ محمد تمام کی امامت سے جنازہ کی نماز پڑھی گئی۔ پھر جامع دمشق میں نماز ہوئی۔ جب جنازہ چلا تو یہ کثرت تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا لوگ دور سے رومال عمامے چادر پھینکتے تھے کہ جنازہ سے چھو جائیں تو ان کو تبرک بنائیں۔

جنازہ سروں پر چلتا تھا اور آگے بڑھ بڑھ کر کشمکش سے پیچھے ہٹ ہٹ جاتا تھا ہر چند پہلے سے کچھ اطلاع نہ تھی۔ فقہا اور مفتیوں نے شہر کو علامہ کا دشمن بنا دیا تھا۔ تاہم ڈھائی لاکھ آدمی جنازہ میں ساتھ تھے جن میں پندرہ ہزار عورتیں تھیں۔ رستہ میں لوگ زار زار روتے جاتے تھے ۱؎۔ پردیں نشیں عورتوں بالانشین اور کوٹھوں پر جنازہ کی طرف منہ کر کے نوحہ کرتی تھیں نماز میں صف قائم نہ رہ سکی صف سے صف اس طرح پیوستہ تھی کہ بیٹھنا تک ناممکن تھا۔ اسی حالت میں ایک شخص نے پکارا کہ اہلسنت کا جنازہ یوں اٹھتا ہے۔ اس پر مجمع چیخ اٹھا۔ اور تمام فضا گونج گئی۔ علامہ کے بھائی زین الدین نے نماز پڑھائی اور مقبرہ صوفیہ میں اپنے بھائی شرف الدین کے پہلو میں دفن ہوئے۔

اس وقت ریل اور جہاز نہ تھے لیکن تمام دنیائے اسلام میں یہ خبر پھیل گئی اور

۱؎۔ فوات الوفیات

ہر جگہ غائبانہ نمازیں پڑھی گئیں۔ مسافروں نے بیان کیا کہ چین میں ان کے جنازہ کی نماز پڑھی گئی۔ اور منادی یہ پکارتا تھا کہ

الصلوۃ علی ترجمان القرآن ۱؎

(مترجم قرآن کی نماز)۔ (الندوہ جلد ۵ نمبر ۶)

ا۔ یہ تمام حالات طبقات ابن رجب اور فوات الوفیات سے لیے گئے ہیں۔

☆☆☆

متنبی

الندوہ میں ہم نے اخلاق عرب کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کا صرف ایک نمبر نکل کر رہ گیا۔ آئندہ وہ سلسلہ پھر شروع ہوگا لیکن اس مضمون میں بھی اس عنوان کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

متنبی اگرچہ چوتھی صدی کا شاعر ہے۔ جب کہ شعرائے عرب کے تمام اوصاف مٹ چکے تھے۔ اور جبکہ شاعری بھی صرف بھٹئی اور گداگری رہ گئی تھی تاہم چونکہ متنبی کا بچپن صحرائے عرب اور بدویوں میں گزرا تھا اس لیے عرب کے بہت سے شریفانہ اخلاق اس میں نظر آتے ہیں۔ متنبّی کا کلام درس میں داخل ہے۔ لیکن درس کا طریقہ ایسا ہے جس سے طلبہ میں بجز اس کے کہ اشعار کے معمولی معنی یاد کرلیں۔ کسی قسم کی استعداد پیدا نہیں ہوتی۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر یہ پوچھا جائے کہ متنبی کا خاص انداز کیا ہے؟ اسکے ہ عصر شعرا سے اس کو کیا نسبت ہے؟ اس کی شاعری میں کیا عیوب ہیں اور کیا محاسن ہیں؟ تو طلبہ تو ایک طرف اکثر علماء بھی اس کے جواب سے قاصر رہیں گے اس لیے ہم نے اختصار کے ساتھ اس کے کلام پر تنقید بھی کی ہے اور یہ حصہ طلبہ اور علماء کے خاس ملاحظہ کے قابل ہے۔

متنبّی[1] کا نام ونسب یہ ہے کہ احمد بن الحسین بن الحسن بن عبدالصمد جعفی کندی

1۔ متنبّی کے حالات اگرچہ اکثر تذکروں میں ملتے ہیں لیکن خزانۃ الادب (جلد اول صفحہ ۳۸۲)

کوفی کوفہ میں ایک محلّہ تھا جس کو کندہ کہتے تھے متنبّی اسی محلّہ میں سنہ ۳۰۳ھ میں پیدا ہوا۔ اسی محلّہ میں ایک مکتب تھا جس میں شرفائے کوفہ کی اولاد تعلیم پاتی تھی متنبّی نے اسی مکتب میں تعلیم پائی۔ اس زمانہ تک مکاتب میں ادب شعر اور نعت کی تعلیم ہوتی تھی متنبّی نے بھی یہی فنون حاصل کیے۔

شباب کا ابھی آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کا باپ اس کو لیے کر عرب چلا گیا۔ اور ایک مدت تک مختلف قبیلوں میں دورہ کرتا رہا۔ خلفائے بنوامیہ کے ہاں دستور تھا کہ بچپن ہی میں اولاد کو قبائل عرب کے یہاں بھیج دیتے تھے تاکہ ان میں دلیری، آزادی اور زورِ تقریر کے وہ جواہر پیدا ہوں جو صحرا نوردعربوں کا خاصہ ہیں۔ متنبّی کو خوش قسمتی سے یہ موقع ہاتھ آیا کہ اس کی سوانح میں عزم اور بلند ہمتی کے جو آثار نظر آتے ہیں اسی تربیت کے نتائج ہیں۔

متنبّی فطرتاً شاعر تھا۔ بدویوں میں رہ کر یہ ملکہ اور راسخ ہو گیا۔ اس نے ہوش سنبھالنے کے ساتھ شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور چونکہ عام عرب کے انداز کے خلاف اس ی طبیعت مضمون آفرینی اور نازک خیالی کی طرف مائل تھی۔ اس کو اپنا کلام تمام شعراء سے ممتاز نظر آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اور اپنے اشعار کو ایک معجزہ قرار دیا۔ سوانح متنبّی میں لکھا ہے کہ اس نے قرآن کے جواب میں ایک کتاب بھی لکھی تھی چنانچہ اس کے چند فقے یہ ہیں۔

والنجم السیار والفلک الدوار واللیل والنھار ان الکا فرلفی اخطار امض علی سنتک واقف اثر من کان قبلک من المرسلین فان اللہ قامع بک زیغ من الحد فی الدین وضل عن السبیل

میں نہایت مستند ذریعہ سے اس کے حالات لکھے ہیں۔ایک مستقل کتاب بھی اس کی سوانح عمری میں لکھی گئی ہے جو شرح دیوان متنبّی کے حاشیہ پر مصر میں چھاپی گئی ہے اور جس کا نام "الصبح المنبی" ہے۔

ابو العلاء معری اور عبداللہ بن المقفع کی نسب یہ بھی مشہور ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کا جواب لکھا تھا لیکن ہمارے نزدیک یہ سب یاروں کے لطیفے ہیں جو گرمی محفل کے لیے تصنیف رلیے گئے ہیں۔متنبّی اور عبداللہ بن المقفع لا مذہب اور بے دین سہی لیکن بد مذاق اور بے تمیز نہ تھے کہ ایسے متبذل کلام کو کلام الٰہی کے سامنے پیش کرتے۔

بہر حال متنبّی نے صحرائے سماوہ میں نبوت کا دعویٰ کیا اور قبیلہ بنی کلب وغیرہ اس کے مرید ہو گئے۔جب یہ فتنہ زیادہ بڑھا تو امیر لولو نے جو سلطنت آخشیدیہ کی طرف سے حمص کا گورنر تھا۔متنبّی کو گرفتار کر لیا قید خانہ بھیج دیا۔مدت کی قید کے بعد متنبّی نے توجہ کی اور قید سے نجات پائی۔۔اب اس نے شاعری کو ذریعہ معاش قرار دیا' امراء اور اغنیاء کی شان میں قصائد لکھتا اور انعام حاصل کرتا تھا۔ایک مدت تک اس کے اشعار بہت سستے داموں بکتے تھے یہاں تک کہ ایک قصیدہ جس کا مطلق یہ تھا:

ایا لا یمی ان کنت وقت اللوائم

علمت بمابی بین تلک المعالم

سو اشرفیاں ملیں' اور یہ پہلا دن تھا کہ متنبّی کی شہرت نے پر پرواز نکالے۔

اس زمانے میں مصر و شام میں جو فرمانروا تھے ان میں سے سب سے زیادہ نامور سیف الدولہ تھا۔وہ عربی النسل اور حمدان کے خاندان میں سے تھا۔ایشیائے کوچک میں اس وقت تک قیصر روم کی سلطنت قائم تھی سیف الدولہ اکثر اس پر حملہ آور ہوتا تھا

اور کامیاب نظر آتا تھا۔ بعض معرکوں میں اس نے رومیوں کی ہزاروں فوجیں برباد کر دیں۔ اس کے ساتھ علم و فضل کا بڑا قدر دان تھا اور خود نکتہ سنج اور نکتہ داں تھا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ شعرا اور مصنفین جس قدر اس کے دربار

۱۔ ابن خلکان

میں جمع ہوئے اور ہارون الرشید اور مامون الرشید کے سوا اور کسی کے دربار میں ایسا مجمع نہیں ہوا۔ حکما میں فارابی اور مصنفین میں صاحب اغانی اسی کے دربار سے فیضیاب تھے۔

سیف الدولہ کے امراء میں ابو العشائر ایک قدر دان امیر تھا۔ متنبّی نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے۔ اور اس کو اس قدر اپنا گرویدہ بنا لیا کہ اس نے سنہ ۳۳۷ھ میں سیف الدولہ کے دربار میں سفارش کی متنی اب اس رتبہ پر پہنچ گیا تھا کہ بلند ہمتی اور خودداری کے اوصاف جو اسنے عرب سے سیکھے تھے۔ ان سے کام لے۔ چنانچہ سیف الدولہ کے دربار میں جانے کے لیے اس نے چند شرطیں پیش کیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ دربار میں بخلاف اور شعرا کے بیٹھ کر قصیدہ پڑھے گا۔ سیف الدولہ نے اس کا کلام سنا تو کہا کہ بے شبہ متنبّی کو ایسی شرطوں کے پیش کرنے کا استحقاق تھا سیف الدولہ نے یہ دیکھ کر کہ متنبّی میں سپہ گری کے جوہر بھی پائے جاتے ہیں اس کو فنون سپہ گری کی تربیت دلوائی۔ چنانچہ حلب میں اساتذہ فن کے سپرد کیا کہ شہسواری اور نیزہ بازی کے کرتب سکھائیں۔ سیف الدولہ ایشیائے کوچک پر جو حملے کرتا تھا متنبّی اکثر اس میں شریک ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ معرکہ جنگ کی تصویر جس طرح وہ کھینچ سکتا ہے اس کے معاصرین سے نہیں کھنچ سکتی۔

سیف الدولہ اگرچہ متنبّی کی قدردانی میں کوئی کمی نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ جب اس نے دریافت کیا کہ متنبّی کو دفتر انعام سے کس قدر رقم دی جا چکی ہے تو معلوم ہوا کہ چار برس کی مدت میں پینتیس ہزار اشرفیاں اس کو مل چکی ہیں تاہم وہ متنبّی کی بے حد خود پرستی اور غرور سے تنگ آ گیا۔ اس لیے کہ اس کا غرور توڑنے کے لیے وہ اکثر دربار کے اور شعراء کو متنبّی کا مقابلہ کا حوصلہ دلاتا رہتا تھا۔ متنبّی کو یہ سخت ناگوار ہوتا تھا اس کے سوا ناراضی کے اور اسباب بھی جمع ہو جاتے تھے۔ متنبّی کے آنے سے پہلے سیف الدولہ کے دربار میں ابوالعباس نامی شاعر بڑا رسوخ رکھتا تھا۔ لیکن متنبّی کی سحر کاریوں نے اس کا رنگ پھیکا کر دیا۔ ایک دن تنہائی میں ابوالعباس نے اس کی شکایت کی کہ سیف الدولہ چپ رہا۔ جب ابوالعباس نے زیادہ اصرار کیا تو سیف الدولہ نے کہا کہ تم متنبّی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیا تم متنبّی کے اس شعر کا جواب کہہ سکتے ہو؟

یعود من کل فتح غیر مفتخر

وقد اعد علیہ غیر محتفل

وہ فتح پر فتح حاصل کرتا ہے لیکن اس کو غرور پیدا نہیں ہوتا۔

حالانکہ جب لڑائی کے لیے چلا تھا تو کچھ تیاری بھی نہیں کی تھی۔

ابوالعباس بڑا برہم ہو کر اٹھا، اور اس کو یقین ہو گیا کہ متنبّی کے آگے اس کا چراغ نہیں جل سکتا۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ امیر ابوفراس جو سیف الدولہ کا بھائی تھا اور بہت بڑا شاعر تھا متنبّی کی نخوت پرستی سے ناراض ہو کر سیف الدولہ کے پاس گیا اور کہا کہ آپ اس مغرور کو تین ہزار دینار سالانہ دیتے ہیں حالانکہ اس تنخواہ میں بیس شاعر اس درجہ کے مل سکتے ہیں۔ غرض دربار کا دربار متنبّی کا مخالف ہو گیا اور سب نے سیف الدولہ کے کان بھرنے شروع کر

دیے۔ آخر سیف الدولہ نے ناراضی کا اظہار کیا۔ اس موقع پر اگر کوئی اور ایرانی شاعر ہوتے تو اس حد تک خوشامد اور غلامانہ تملق کرتا کہ خواہ مخواہ ممدوح کا دل نرم ہو جاتا۔ لیکن ایک عرب کا شاعر ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ متنبّی نے ایک اور قصیدہ لکھا جس میں نہایت آزادی اور دلیری سے سیف الدولہ کی ناقدردانی اور ناانصافی اور اپنی بلند قدری اور خودداری ظاہر کی۔ اس قصیدہ کے جستہ جستہ اشعار سننے اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

ہم ان میں سے چند اشعار کا ترجمہ درج کرتے ہیں:

اے سب سے زیادہ عادل (بجز میرے معاملہ کے) تیرے ہی دربار میں نزاع ہے اور تو ہی دشمن اور تو ہی ثالث ہے۔ آدمی کو آنکھ سے کیا حاصل، اگر اس کو تاریکی اور روشنی میں فرق معلوم نہ ہو۔ (یعنی سیف الدولہ کو نیک و بد کی تمیز نہیں معلوم) مجھ کو گھوڑے، راتیں، صحرا، تلوار، نیزے اور کاغذ قلم سب پہچانتے ہیں کاش یہ بادل (سیف الدولہ) جہاں برستا ہے وہیں جا کر گرجتا بھی (یعنی جن پر مہربانی کرتا ہے انہی پر ناراض بھی ہوتا)۔

اس قصیدہ پر تمام دربار برہم ہوا۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے سیف الدولہ کی زبان سے ابوالعشائر کے پاس کہلا بھیجا کہ متنبّی نے یہ گستاخیاں کیں ابوالعشائر نے دس آدمی انطاکیہ سے روانہ کیے کہ متنبّی کو سزا دیں۔ سیف الدولہ کے آستانہ پر متنبّی سے ایک اور ان سے مٹ بھیڑ ہوئی، ایک نے متنبّی کی باگ پر ہاتھ ڈالا متنبّی نے تلوار کا ہاتھ مارا جو کمان کو کاٹ کر ہاتھ تک پہنچا اور وہ شخص زخمی ہو کر گرا، اب سب نے مل کر تیر برسائے لیکن متنبّی لڑ بھڑ کر نکل آیا۔

غرض سنہ ۳۴۶ھ میں متنبّی حلب سے جو سیف الدولہ کا پایہ تخت تھا نکلا اور دمشق میں آیا۔ دولت عباسیہ کے ضعف سے مل میں ہر طرف خودمختار حکومتیں قائم ہو گئی تھیں جو برائے نام دربار خلافت سے اپنا تعلق ظاہر کرتی تھیں انہی میں مصر کی سلطنت تھی جس کا فرمانروا اس

وقت کافور کا ایک خواجہ سرا تھا۔ اسلام نے غلاموں کو جو رتبہ دیا اس کے نتائج میں ایک یہ بھی تھا کہ مصر و شام کی وسیع سلطنت ایک حبشی غلام کے قبضہ اقتدار میں تھی اور اس کا خطبہ حرمین میں پڑھا جاتا تھا۔ کافور پہلے نہایت ادنیٰ درجے کا غلام تھا چونکہ نہایت کریہ المنظر اور عجیب الہیتہ تھا راہ چلتے لوگ اسے چھیڑتے تھے رفتہ رفتہ والی مصر ابوبکر بن طغج کی خدمت میں پہنچا جس کو دربار خلافت سے آخشید کا لقب ملا تھا۔ ابوبکر کے مرنے پر کافور نے اس قدر اقتدار حاصل کرلیا کہ اس کا جانشین بن گیا۔ اور جب تک زندہ رہا بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ مصر و شام و حجاز نجد و یمن میں اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔

متنبّی مداحی اور بھٹئی کے بالطبع متنفر تھا وہ چاہتا تھا کہ کسی سوبہ یا ضلع کی حکومت مل جائے تو آزادانہ زندگی بسر کرے۔ اسی توقع پر وہ کافور کے دربار میں حاضر ہوا۔ پہلا قصیدہ جو سنہ ۳۴۶ھ میں اس نے کافور کے سامنے پڑھا اس کا مطلع یہ ہے:

کفی بک داءً ان تری الموت شافیا

وحسب المنایا ان یکن امانیا

کافور نے مختلف موقعوں پر اس کو گراں قدر صلے دیے لیکن اس کی بلند نظری کو ان چیزوں سے تسلی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے اکثر قصیدوں میں اس خیال کو ظاہر کیا ایک قصیدہ کا خاتمہ یہ ہے:

فارم بی ما اردت نی فانی

اسد القلب ادمی الرواء

جو خدمت چاہے میرے سپرد کر

کیونکہ میں آدمی کی صورت میں شیر ہوں

وفوادی من الملوک وان کا

ن لسانی من الشعراء

میرا دل بادشاہوں کا دل ہے
گو میری زبان شاعروں کی ہے

ایک اور قصیدہ میں لکھتا ہے:

ابا المسک هل فی الکاس فضل اناله

فانی اغنی منذحین و تشرب

اے کافور پیالہ میں کچھ باقی بھی ہے جو میرے کام آئے
بڑی دیر سے میں گا رہا ہوں اور تو پی رہا ہے

وهبت علی مقدار کفی زماننا

ونفسی علی مقدار کفک یطلب

تو نے جو دیا وہ زمانہ کے ہاتھوں کے انداز سے دیا
لیکن میں تو تیرے ہاتھ کے انداز سے چاہتا ہوں

اذالم تنط بی ضیعة اوولایة

فجودک یکسونی وسعلک یسلب

اگر تو نے مجھ کو کوئی جاگیر یا کہیں کی حکومت نہ دی
تو تیری سخاوت مجھ کو کپڑے پہنائے گی اور دربار میں اس کو چھین لے گی۔

کافور متنبّی کی درخواست منظور کر لیتا لیکن متنبّی کی بلند حوصلگیوں کا اس کو جو تجربہ ہوا اس نے یقین دلایا کہ متنبّی کی حوصلہ مندی کی یہ ابتدائی منزلیں ہیں اور وہ سلطنت اور حکومت کے بغیر چین نہیں لے سکتا۔ متنبّی کو جب اپنی ناکامی کا یقین ہو گیا تو اس نے کافور کے دربار

میں جانا چھوڑ دیا اور ہر طرح کے تعلقات ترک کر دیے۔ ایک ایشیائی دربار میں اس قسم کی گستاخی بہت بڑا جرم تھی کافور نے متنبّی کو سزا دینی چاہی جس کی ابتدا یہ تھی کہ متنبّی پر پہرے بٹھا دیے گئے کہ بھاگ کر نکل جانے نہ پائے۔ سوانح متنبّی میں لکھا ہے کہ جب کافور نے متنبّی کو ضرر پہنچانے کا ارادہ کیا اور اس کی جان معرض خطر میں آ گئی تو بعض شخصوں نے ہمدردی کے لحاظ سے متنبّی کو اس حال سے مطلع کر دینا چاہا لیکن کافور کے خوف سے یہ جرات نہ کر سکے۔ متنی نے آخر تنگ آ کر کافور کی ہجو لکھی جس کے دو شعر یہ ہیں:

صارا الحضی امام الابقین بها

فالحر مستعبد و العبد معبود

یہاں ایک خواجہ سرا فراری غلاموں کا امام ہے

آزاد غلام بن گئے ہیں اور غلام معبود بن گیا ہے

ما کنت احسبنی ابقی الی زمن

یسئی بی فیه کلب وهو محمود

میں یہ نہیں خیال کرتا تھا کہ میں ایسا زمانہ دیکھوں گا

ج میں ایک کتا مجھ کو ستائے اور پھر مجھ کو اسی کی تعریف کرنی پڑے

سلاطین اور امراء سے ناراض ہو کر ہجو لکھنا ایشیائی شعرا کا عام شعار تھا اور یہ ایشیائی شاعری کے چہرہ کا بڑا بدنما داغ ہے۔ فردوسی نے محمود کے تمام احسانات اور کارناموں کو یہ کہہ کر مٹا دیا:

پرستار	زادہ	نیاید	بکار
دگر چند	دار	زپدر	شہریار

تاہم متنبّی میں اس قدر شرافت کی ادا نظر آتی تھی کہ گو وہ اکثر امرا اور ہم عصروں سے

ناراض ہوا لیکن ہجو صرف انہی کی لکھی جو ہجو کے قابل بھی تھے۔ سیف الدولہ سے بھی وہ ناراض ہوا اور یہ ناراضی بجا بھی تھی۔ تاہم اس نے بج ایک دوستانہ شکایت آمیز قصیدے کے ایک حرف بھی اس کی شان میں نہیں کہا۔

متنبّی نے سمجھ لیا تھا کہ ہجو کے بعد مصر میں رہنا آسان نہیں چنانچہ اس نے پہلے سے تیاریاں کر رکھی تھیں۔ جس راستہ سے سفر کرنا تھا آدمی بھیج کر جا بجا زمین کے نیچے نیزے اور ہتھیار دبوا دیے۔ جان نثار غلاموں کو مسلح کیا دس دن کی خوراک کے موافق اونٹوں پر پانی کے مشکیزے رکھوا لیے یہ سب سامان کر کے عین عید کے دن سنہ ۳۵۰ھ میں مصر سے نکلا۔ کافور کو یہ خبر ہوئی تو فوراً ہر طرف ناکہ بندیاں کروا دیں۔ تمام عرب قبائل ے پاس قاصد دوڑا دیے کہ متنبّی جہاں ملے گرفتار کر کے بھیج دو یہ سب کچھ ہوا لیکن متنبّی دو منزلہ سہ منزلہ طے کرتا لڑتا بھڑتا صاف نکل گیا۔ راہ میں اس کے غلاموں نے بے وفائی کی اس نے ان کو بھی چھوڑا اور جریدہ و تنہا تمام منزلیں طے کیں کوفہ میں پہنچ کر ایک طول طویل قصیدہ لکھا جس میں سفر کے تمام حالات اور راستہ کے مقامات نہایت تفصیل سے بیان کیے۔ چنانچہ مقامات کے نام گنا کر فخریہ لکھتا ہے۔

فلما انخنار کذنا الرما
ح فوق مکارمنا و العلا

جب میں سواری سے اترا
تو نیزوں کو بلند ہمتی اور شرافت کی سطح پر گاڑا

وبتنا نقبل اسیافنا
و نمسحها من دماء العدا

اور تلوار کو بوسے دیے

اور دشمنوں کے خون کے دھبے مٹائے

لتعلم مصر و من بالعراق

و من بالعواصم انی الفتی

تا کہ مصر اور عراق اور عواصم کو

معلوم ہو جائے کہ میں مرد ہوں

کوفہ سے متنبیؔ نے بغداد کا رخ کیا۔ بغداد اس زمانے میں ویلیموں کے زیر اثر تھا اور مہلبی جو معز الدولہ کا وزیر تھا سیاہ و سپید کا مالک تھا۔ متنبیؔ اس کے دربار میں حاضر ہوا اتفاق سے اس وقت ابوالفرج اصفہانی (مصنف کتاب الاغانی) بھی موجود تھا۔ علمی چرچے ہو رہے تھے کہ کسی نے یہ شعر پڑھا۔

سقی الله امواها عرفت مکانها

جراما و ملکو ماوبذرا فابغمرا

متنبیؔ نے کہا کہ حراما نہیں بلکہ جرابا صحیح ہے۔ ابوالفرج اصفہانی نے اس سے انکار کیا۔ متنبیؔ دوسرے دن بھی دربار میں گیا تو مہلبی منتظر تھا کہ مدحیہ قصیدہ کہہ کر لایا ہوگا۔ لیکن متنبیؔ اس درجہ کے لوگوں کی مداحی کو عار سمجھتا تھا۔ تیسرے دن بھی جب متنبیؔ خالی ہاتھ گیا تو مہلبی کو نہایت رنج ہوا۔ اس نے شعرا کو اشارہ کیا کہ متنبی کی خبر لیں۔ چنانچہ شعرا نے ہجوں کا طومار لگا دیا لیکن متنبیؔ کو خبر تک ہوئی اور جب لوگوں نے کہا کہ آپ کی طرف سے بھی جواب ہونا چاہیے تو اس نے کہا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں؛

و اذا اتتک مذمتی من ناقص

فھی الشھادۃ لی بانی کامل

جب کم درجہ کے لوگ میری برائیاں بیان کریں

تو یہی دلیل ہے کہ میں کامل ہوں

بغداد کی ناقدردانی دیکھ کر متنبّی نے یہاں سے بھی نکلنے کا ارادہ کیا۔ بغداد چھوڑ کر اہل فن کا کہیں ٹھکانا تھا تو فارس و شیراز تھا جو عضد الدولہ کا پائے تخت تھا عضد الدولہ ازمانے کا سب سے بڑا بادشاہ تھا اور اسی وجہ سے شہنشاہ کہلاتا تھا۔ اس کے درباریوں میں محمد بن العمید بڑے پایہ کا شخص تھا۔ خود صاحب علم وفن اور علم وفن کا نہایت قدردان تھا۔ اس کو جب یہ خبر لگی کہ متنبّی نے فارس کا رخ کیا ہے تو اس کو بڑا اتردد پیدا ہوا کہ اگر متنبّی نے مہلبی کی طرح مجھ کو قابل خطاب نہ سمجھا تو میری بڑی تحقیر ہوگی۔ پیش بندی کے طور پر جب

۱۔ خزانۃ الادب تذکرہ متنبّی

متنبّی کا ذکر آتا تو حقارت سے نام لیتا تھا اصبح المبنی میں لکھا ہے کہ ایک دن ابن العمید کے درباریوں میں سے ایک شخص اس کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ سر جھکائے ہوئے مغموم بیٹھا ہے۔ درباری نے پوچھا کہ حضور کیوں کر متفکر ہیں؟ ابن العمید نے کہا کہ میری بہن کے انتقال میں کچھ اوپر ساٹھ خط تعزیت کے آئے ہیں ہر خط متنبّی کے اس شعر سے شرو ع ہوتا ہے۔

طوی الجزیرۃ حتی جاء نی خبر

فزعت فیه بامالی الی الکذب

ایسے شخص کی شہرت کو میں کیونکر مٹادوں۔

متنبّی نے اگرچہ مختلف موقعوں پر یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ میں بادشاہوں سے نیچے نہیں اترتا اور اسی بنا پر اس نے مہلبی کی مدح سے انکار کر دیا۔ لیکن ابن العمید کے متعلق اس کو اپنی

ضد سے باز آنا پڑا۔ ابن العمید دولت وحشمت، جاہ وجلال، انتظام وتدبر کے لحاظ سے جو کچھ تھا ہی علم وفضل میں بھی وہ متنبّی کا ہمسر بلکہ بعض حیثیتوں سے بڑھ کر تھا۔ علمائے ادب کا اتفاق ہے کہ انشا پردازی اور نثاری میں تمام اسلامی دنیا میں اس کا جواب نہ تھا۔ یہ مشہور فقرہ ہے کہ انشا پردازی عبدالحمید سے شروع ہوئی اور ابن العمید پر ختم ہوگئی۔ صاحب بن عباد جو فن ادب کا ایک رکن ہے ابن العمید ہی کا تربیت یافتہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ فلسفہ وحکمت میں کمال رکھتا تھا اس لیے متنبّی نے اگر اسکی مداحی گوارا کی تو کچھ بے جا نہ کیا۔ تاہم مداحی میں یہ آن قائم رکھی کہ مدح امیرانہ انداز سے نہیں کی بلکہ اس کے علمی اوصاف بیان کیے۔ بخلاف اس کے شعرائے عجم کسی شاعر یا مصنف کی بھی مدح کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سکندر و دارا کی داستان سنا رہے ہیں۔

بہرحال متنبّی نے ارجان کا رخ کیا جہاں ابن العمید قیام پذیر تھا۔ شہر سے باہر ایک جگہ پر ٹھہر کر اپنے غلام کو بھیجا کہ ابن العمید کو جا کر خبر کرے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا اور ابن العمید خواب راحت کرنا چاہتا تھا کہ یہ مژدہ پہنچا بے ساختہ اٹھ بیٹھا اور نہایت استعجاب سے پوچھا کیا واقعی متنبّی یہاں آ گیا ہ۔ اسی وقت استقبال کے لیے اپنے خاص حاجب کو بھیجا حاجب سوار ہوا تو جو لوگ راہ میں ملتے تھے سب کو ساتھ لیتا گیا متنبّی بڑے سروسامان سے شہر میں داخل ہوا، دربار میں آیا تو العمید نے سروقد تعظیم دی۔ متنبّی کے لیے پہلے سے ایک کرسی بچھا دی گئی تھی جس پر کمخواب کا گدا پڑا ہوا تھا۔ ابن العمید نے کہا میں آپ سے ملنے کا بڑا مشتاق تھا۔ معمولی بات چیت کے بعد متنبّی نے آستین سے ایک کاغذ نکالا اور یہ قصیدہ پڑھا۔

بادھواک صبرت اولم تصبرا

وبکاک ان لم تجرد معک اوجری

تشبیب کے بعد مدح کے بعض اشعار یہ ہیں:

من مبلغ الاعراب عنی اننی

شاهدت رسطالیس والا سکندرا

بدویوں سے یہ پیغام کون جا کر کہے گا

کہ میں نے ارسطو اور سکندر دونوں کو دیکھا

وسمعت بطلیموس دارس کتبه

متملکا متبدیا متحضرا

میں نے بطلیموس کو درس دیتے سنا

جو فرمانروا بھی ہے، بدوی بھی ہے شہری بھی ہے

ابن العمید نے متنبّی کی شاگردی اختیار کی یعنی مجموعہ نعت جو متنبی نے خاص اپنی تحقیق اور تفحص سے مرتب کیا تھا اس سے پڑھا۔

ابن العمید نے خلعت اور تحائف کے علاوہ پچاس ہزار اشرفیاں متنبّی کی نذر کیں۔[۱]

متنی ارجان ہی میں تھا کہ عضد الدولہ کو یہ خبر پہنچی اس لیے ابن العمید کو لکھا کہ متنبّی کو یہاں بھیج دو ابن العمید نے یہ پیغام متنبّی سے کہا عجمی میری قدر کیا جان سکتے ہیں۔ ابن العمید نے کہا عضد الدولہ مجھ سے ہر بات میں بڑھ کر ہے۔ متنبّی نے کہا کہ مُیں بادشاہوں سے ملاقات سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں ان کو بقائے دوام

---

[۱] یہ پوری تفصیل خزانۃ الادب میں ہے۔

کا تاج پہنا دیتا ہوں اور ہو مجھ کو صلہ میں ایسی چیزیں دیتے ہیں جو چار دن بھی

نہیں ٹھہرتیں۔اس کے علاوہ میں ایک جگہ جم کر قیام نہیں کر سکتا اور سلاطین مجھ کو قیام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑی بے لطفی سے مجھ کو قطع تعلق کرنا پڑتا ہے۔ابن العمید نے تمام باتیں عضد الدولہ کو لکھ بھیجیں۔وہاں سے جواب آیا کہ متنبّی کو ہر بات کا پورا اختیار ہے۔غرض متنبّی ارجان سے روانہ ہوا شیراز کو جل بارہ میل باقی رہ گئے تو عضد الدولہ نے ابو عمر صباغ کو متنبّی کی پیشوائی کے لیے بھیجا دونوں ساتھ ساتھ آئے۔صباغ کی فرمائش پر متنبّی نے راہ میں قصیدہ مصریہ کے اشعار سنائے۔متنبّی کے لیے پہلے ایک آراستہ مکان تیار رکھا گیا تھا۔سفر کی تکان مٹنے کے بعد وہ عضد الدولہ کے دربار میں گیا اور عجد الدولہ کے تخت شاہی سے متصل دربار کے قاعدہ کے مطابق پا انداز کو بوسہ دیا پھر سروقد کھڑا ہوا اور کہا کہ میں اس سواری کا ممنون ہوں جو مجھ کو یہاں تک لائی۔عضد الدولہ نے گرم جوشی لیس سفر کے حالات پوچھے۔متنبّی نے مناسب جواب دیا۔

چند روز کے بعد مدحیہ قصیدہ لے کر گیا اور چاہا کہ دربار کے دستور کے مطابق کھڑ ہو کر پڑھے لیکن عضد الدولہ نے بٹھا لیا۔متنبّی قصیدہ پڑھ کر چلا آیا تو عضد الدولہ نے کافور، عنبر مشک عود اسپ خاصہ جو پچاس ہزار بکریوں کے عوض خریدا گیا تھا۔کمخواب کے استر کی چار در، عمامہ جب کی قیمت پانچ ہزار دینار تھی۔ہندوستانی مرصع تلوار جس کا پر تلا سونے کا تھا۔ان سب کے علاوہ روپیوں کے توڑے صلے میں بھیجے۔ایک موقع پر جب اس نے گل افشانی کے جشن میں یہ شعر پڑھے:

قد صدق الورد فی الذی زعما

انک صیرت نثرہ دیما

کانما مایج الھواء بہ

بحر حری مثل مائہ عتما

تو شاہانہ خلعت عطا کیا۔

متنبّی نے اگرچہ عضد الدولہ کی مدح میں بہت کچھ زور طبیعت صرف کیا لیکن سیف الدولہ کے علمی دربار میں جن حریفوں کا اس کو مقابلہ رہتا تھا اس پایہ کے لوگ عضد الدولہ کے دربار میں کہاں سے آسکتے تھے۔ اس لیے کلام میں وہ زور نہ پیدا ہو سکا۔ عضد الدولہ نے اس تنزل کو محسوس کیا چنانچہ لوگوں کسے کہا کہ متنبّی کا زور کلام اسی وقت تک رہا جب تک وہ عرب میں تھا۔ متنبّی نے سنا تو کہا کہ جیسے مخاطب ہوتے ہیں ویسا ہی شعر بھی کہا جاتا ہے۔

تاہم عضد الدولہ نے قدردانی میں کچھ کمی نہیں کی۔ سوانح متنبّی میں لکھا ہے کہ متنبّی کو دو لاکھ درہم صلہ میں عطا کیے گئے۔ آخر متنبّی کا دل یہاں سے بھی اچاٹ ہو گیا۔ ایک وداعی قصیدہ لکھا اور عضد الدولہ سے رخصت ہو کر کوفہ کو روانہ ہوا۔ اہواز پہنچ کر مقام کیا راہ میں بارش کی وجہ سے اسباب اور کپڑے نم ہو گئے۔ صندوق کھلوا کر کپڑے دھوپ میں پھیلا دئے ابوالحسن سوسی کا بیان ہے کہ اس وقت میں موجود تھا رنگین اور بیش بہا کپڑے میدان میں پھیلائے گئے ت یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف چمن کھل گیا ہے۔

متنبّی کی دولت مندی کی خبر عام ہوئی تو بدویوں کا سردار فاتک اسدی آیا اور متنبی سے کہا کہ آگے راستہ بہت پرخطر ہے اگر ارشاد ہو تو میرے قبیلہ کے آدمی حضور کے ہمراہ جائیں حضور ان کو کچھ انعام دلا دیں۔ متنبّی کو اپنی شجاعت اور سپہ گری پر ناز تھا۔ اس کے ساتھ وہ نہایت بخیل اور جزرس بھی تھا۔ تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ جب تک یہ میرے ساتھ ہے میں آسمان کے نیچے کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ فاتک اٹھ کر چلا گیا اور ساٹھ ستر آدمی لے کر ایک کمین گاہ میں چھپ بیٹھا۔ متنبّی سامنے سے گزرا تو دفعتہً حملہ آور ہوا۔ متنبّی دیر تک لڑتا رہا لیکن ایک آدمی جماعت کثیر کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ شکست کھائی اور چاہا کہ جان بچا کر نکل جائے متنبّی کے غلام نے کہا کہ آپ کو وہ شعر کیا ہوا:

الخیل و اللیل و البیداء تعرفنی

و الحرب و الضرب و القرطاس و القلم

مجھ کو گھوڑے ، راتیں صحرا

جنگ و جدل کاغذ اور قلم سب پہچانتے ہیں

متنبّی نے کہا ہاں خوب یاد دلایا یہ کہہ کر پلٹا اور لڑ کر مارا گیا۔

اس قسم کا موقع ایران کے مشہور شاعر انوری کو بھی پیش آیا تھا یعنی راستہ میں چوروں نے آ لیا تھا انوری کے ساتھ ایک درزی اور ایک حکیم صاحب بھی تھے سب جان بچا کر بھاگنے لگے انوری نے اس واقعہ کو خود لکھا ہے اور معذرت یہ کی ہے کہ:

حکیم و شاعر درزی چگو نہ جنگ کند

بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ فاتک اسدی کی دشمنی کی یہ وجہ تھی کہ متنبّی نے قبیلہ بنو ضبہ کی ہجو لکھی تھی۔ بہر حال جو کچھ ہوا فاتک کی ناقدردانی نے ایک ایسے شخص کو کھو دیا جس کا جواب اس وقت سے آج تک نہ پیدا ہو سکا۔

متنبّی کے ساتھ اس کا بیٹا اور غلام بھی مارا گیا اور اس کی بے شمار دولت بے رحم غارتگروں کے ہاتھ آئی۔

زمرغان حرم درکام زاغان طعمہ انداز د

مدار روزگار سفلہ پرور راتماشا کن

(الندوہ جلد ۲ نمبر ۴)

جون سنہ ۱۹۰۵ء

☆☆☆

موبدان مجوس

(ہندوستان میں)

مسلمانوں کا تاریخی سرمایہ جو بہت کچھ مفقود ہو چکا اور ہوتا جاتا ہے اس نے علاوہ اور بہت سے نقصانات کے سب سے بڑا نقصان یہ پہنچایا کہ خود مذہب اسلام کے متعلق دنیا کو عجیب عجیب غلطیاں اور بدگمانیاں پیدا ہو گئیں اور ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اب خود مسلمان بھی ان غلطیوں سے بچ نہیں سکتے۔ وہ بھی مذہب کی حقیقت وہی سمجھتے ہیں جو معلومات کے مفقود ہونے سے کئی سو برس سے قائم کر دی ہے۔

اہل یورپ کا یہ خاصہ ہے کہ دو ہم زمان واقعہ کو عموماً علت و معلول فرض کر لیتے ہیں مثلاً جب تاریخ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسالم کے بعد ایرانیوں کا لٹریچر برباد ہو گیا تو وہ قطعی طور سے فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ اسلام ہی کے طرز عمل کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی کسی اسلامی تاریخ میں پارسی قوم کے معابد کا پیشوایان مذہب کا تصنیفات کا تعلیم و تلقین کا پتہ نہیں چلتا تو ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ سلاطین ہندوستان نے تعصب کی وجہ سے یا تو سرے سے ان کو ملک میں گھسنے نہ دیا ایسی حالت میں رکھا کہ ان کی کوئی امتیازی حیثیت قائم نہ رہی جس سے ان کے متعلق کسی قسم کی کوئی اطلاع حاصل ہو سکتی۔

لیکن اصل حقیقت ی ہے کہ جو کچھ ہے تاریخی کم ما یگی کا تصور ہے۔ہم اس مضمون میں پارسیوں کے پیشوایان مذہبی (جن کو موبد کہتے ہیں) کا مختصر حال لکھنا چاہتے ہیں۔[1] جو ہندوستان میں سکونت رکھتے تھے اور جن کی تصنیفات و تالیفات وسعت کے ساتھ اہل علم میں پھیلی ہوئی تھیں اور چونکہ ان کے یہ حالات اسلامی ہی تصنیفات سے لیے گئے تھے اس لیے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کے لٹریری اور تاریخ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

سلطنت تیموریہ میں سب سے پہلے اکبر کے زمانے میں موبدوں کا پتا چلتا ہے۔اکبر نے جس زمانے میں مذہبی کانفرنس قائم کی اور ہر مذہب وملت کے پیشوا دور دور سے بلائے تو ایران سے بھی خط وکتابت کی۔اس زمانہ میں پارسیوں کا پیشوائے کل آذرکیوان تھا۔اس نے آنے میں معذرت کی لیکن ایک عجیب وغریب کتاب اپنی تصنیف بھیجی جس کی نسبت صاحب ماآثر الامرا لکھتے ہیں:

نامہ از مولفات خود کہ مشعر ستایش مجردات وکواکب و متضمن نصائح وحکم بود فرستاد مشتمل بر چہاردہ جز ہر سطر ز پارسی لجت بوذ وتصحیف آن عربی وچون قلب می کردند ترکی و باز مصحف آن ہندی می شد۔[2]

یعنی اس کتاب میں یہ کمال تھا کہ خالص فارسی میں لکھی تھی لیکن اگر نقطوں کو ادل بدل کر پڑھو تو عربی ہو جاتی تھی۔اور الفاظ کو الٹ پلٹ کر پڑھو تو ترکی اور پھر مصحف کرنے سے ہندی ہو جاتی تھی۔

---

[1]۔ یہ مضمون زیادہ تر بلکہ کل دبستان مذاہب سے لیا گیا ہے۔اس کتاب کی نسبت مشہور ہے کہ محسن فانی کشمیری کی تسنیف ہے۔بعض اس کو داراشکوہ کی طرف منسوب کرتے

ہیں لیکن حقیقت میں ہے کہ وہ ذوالفقار اردستانی کی تصنیف ہے جیسا کہ مآثر الامرا (جلد دوم صفحہ ۳۹۲) میں مذکور ہے سب سے پہلے یہ کتاب بمبئی میں سنہ ۱۲۶۲ھ مین چھاپی گئی۔ اس کے بعد اور بہت سے مطابع میں چھپی۔ ۲۔ مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۳۵۸۔

اگر چہ اس ناممکن صنعت پر ہم یقین نہیں کر سکتے لیکن اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں کہ آذر کیوان نے اپنی کوئی تصنیف ضرور بھیجی تھی

آذر کیوان نے تو آنے سے انکار کیا لیکن دوسرا موبد جس کا نام آردشیر تھا حسب طلب آیا اور اپنے ساتھ مذہبی آتش کدہ کی آگ بھی لیتا آیا چنانچہ اس کی حفاظت و اہتمام شیخ ابوالفضل کے سپرد کیا گیا۔ یہ مآثر الامرا کی روایت ہے لیکن دبستان مذاہب کے مصنف نے صاف تصریح کی ہے کہ آذر کیوان ہندوستان میں آیا اور عظیم آباد پٹنہ میں سکونت کی۔ اور سنہ ۱۰۲۷ھ میں ۸۵ برس کے سن میں انتقال کیا۔

ممکن ہے کہ یہ آذر کیوان وہ نہ ہو جس کا ذکر مآثر الامرا میں ہے بلکہ کسی اور موبد کا نام ہو۔ بہر حال یہ آذر کیوان اسفندیار کے خاندان سے تھا۔ دبستان میں اس کا پورا شجرہ نسب لکھا ہے بچپن ہی سے وہ مرتاض اور گوشہ نشین تھا۔ ۱۸ برس خم میں بیٹھا۔ علوم وفنون میں یہ کمال حاصل کیا کہ لوگ اس کو ذوالعلوم لے لقب سے پکارتے تھے۔ عربی زبان کا بھی ماہر تھا۔ فقہا اور صوفیہ اس سے ملتے رہتے تھے اور ان سے پرلطف صحبتیں رہتی تھیں۔ ایک دن کسی فقیہ نے پوچھا کہ آپ جانوروں کے مارنے سے کیوں منع کرتے ہیں۔ بولا کہ جو لوگ کعبہ کا احرام باندھتے ہیں ان کو جانور مارنا حرام ہے۔ دل بھی کعبہ ہے اس لیے جو لوگ اس کا احرام باندھتے ہیں ان کو جانور کا مارنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔

ایک دن ایک شخص نے آذر کیوان سے کہا کہ میں سوداگر تھا رہزنوں کے ہاتھ سے

تنگ آ کر آخر درویشی اختیار کی آذر کیوان نے کہا کہ اب تم خود رہزنی کرو گے۔

آذر کیوان کی تصنیفات سے جام کخیسر و کا ذکر دبستان میں کیا ہے اور اس کے اشعار بھی نقل کیے ہیں جو درج ذیل میں درج ہے:

چوزا بدانہا برگذشتم روان
رسیدم سوئے پاک فرخ روان
بدانستم از بود نیھا ہمہ
شدم باسروش بزرگ رمہ
در و چون بسے برتری یافتم
فروغے زیزداں ہمے تافتم
چوبفزدو پر تو بروقت این مسنی
سروشے بتا بیدا ہرمنی
خدا بودواز من نشا نے نہ بود
فراموش دیار روانے نہ بود
ہم راز خود سایہ می یافتم
بہ ہوش سروشان ہمی تافتم
ز خوشان ہمی تافتم برروان
چنین بہ اندام ہانیز خواں
توانا و داناو والا بدم
چنین تا ازاں پایہ برآمدم
بدان رہ کہ رفتم شدم موئے تن

بصد ایزدی فرہ زاں انجمن
خداوند را پایہ زاں برترست
کہ آمیزش بندہ را درخورست
زدریائے ہستیش گیتے نمے
نم نم بگو چیست بودش ہمے
زمہر و نوازش کند بندہ را
کہ برداشتن شاید افگندہ را
گدارا تو انگر کند مہراو
جہاں پر توے از خود چہراو
مرادرا جزا و کس نیا رو ستود
کہ او درنیا ید بگفت و شنود

آذر کیوان کے تلامذہ کثرت سے تھے ان میں سے چند ممتاز شاگرد جن سے صاحب دبستان نے ملاقات کی تھی اوران کی صحبت سے فائدہ اٹھایا تھا ان کے نام اور مختصر حالات حسب ذیل ہیں:

فرشیدورد

یہ بھی شیراز میں آذر کیوان کے فیض سے مستفید ہوا اور ہندوستان میں سنہ ۱۰۲۹ھ میں وفات پائی۔

خردمند

سام نریمان کے خاندان سے تھا مصنف دبستان پٹنہ میں ان بزرگوں سے ملا تھا چنانچہ خود لکھتا ہے:

''گرد آورنامہ در پٹنہ این چہارم آزادہ یعنی خراد، فرشید ورد، و بہمن وخردمند رادید، و دعائے خیر در بارہ نامہ نگار بجائے آوردند''۔

بہرام بن فرہاد

گودرز کے خاندان سے تھا۔ آذر کیوان جس زمانہ میں پٹنہ میں تھا۔ بہرام شیراز سے چل کر پٹنہ آیا اور تکمیل نفس میں بڑی محنتیں اٹھائیں۔ اس نے فلسفہ کی تما شاخوں میں کمال حاصل کیا تھا اور ان فنون میں عربی پہلوی اور فارسی زبانوں کی تصنیفات سے واقفیت حاصل کی تھی۔ عربی فلسفہ کی کتابیں خواجہ جال الدین محمود سے جو علامہ دوانی کے شاگرد تھے پڑھی تھیں تجارت کے ذریعہ سے بسر کرتا تھا۔ سنہ ۱۰۳۴ھ میں بمقام لاہور وفات پائی۔

بہرام کی تصنیفات میں سے تین کتابیں زیادہ مشہور ہیں۔ شارستان دانش، گلستان بینش، شارستان۔

مصنف دبستان نے پارسیوں کے عقائد وخیالات اکثر ہی کتابوں سے لیے ہیں۔

ہوشیار

سورت میں پیدا ہوا۔ رستم کے خاندان میں سے تھا نہایت راست باز' دلیر' صاحب تدبیر اور مقدمہ فہم تھا۔ آذر کیوان کی صحبت اٹھائی تھی ایک ایک پہر تک حبس نفس کر سکتا تھا کھانے پینے میں کسی چیز سے پرہیز نہیں تھا۔ سنہ ۱۰۵۰ھ میں بمقام آگرہ وفات پائی۔ سر دومستان اس کی تصنیف ہے۔

موبد سروش

زردشت کی نسل سے تھا۔ عربی اور فارسی کے ساتھ ہندی زبان بھی جانتا تھا۔ عربی بہرام بن فرہاد سے حاصل کی تھی۔ تمام عمر شادی نہیں کی۔ گوشت بھی نہیں کھاتا تھا۔ اس کی تصنیفات کثرت سے ہیں مثلاً نوش دارد سبکگیں۔ زردشت افشار وغیرہ۔ محمد محسن ایک فاضل کا بیان ہے کہ میں نے خدا کے ثبوت میں ۳۶۰ دلیلیں اس کی زبان سے سنیں لیکن ان کو قلم بند کرنا چاہا تو نہ کر سکا۔ اکثر خوراق عادات اس سے صادر ہوتے تھے۔ مصنف دبستان نے سنہ ۱۰۳۶ھ میں اس سے بمقا کشمیر ملاقات حاصل کی تھی۔

خدا جوئے

ہرات کا باشندہ تھا۔ مدت تک جویائے حق رہا آخر خواب میں ہدایت ہوئی کہ آذر کیوان سے فیض حاصل ہوگا۔ چنانچہ موبد خوشی کے ساتھ اسطخر گیا اور آذر کیوان کے حلقہ میں شامل ہوا۔ عربی اور فارسی زبان میں مہارت کامل رکھتا تھا۔ اکثر چپ رہتا تھا اور لوگوں کے اصرار سے گفتگو کرتا تھا۔ آذر کیوان کی مشہور کتاب جام کیخسرو کی شرح لکھی۔ سنہ ۱۰۴۰ھ

میں بمقام کشمیر وفات پائی مصنف دبستان نے یہیں اس سے ملاقات کی تھی۔

موبد خوشی

ایک مدت تک حق کی تلاش میں تمام دنیا پھرتا رہا۔ آخر آذر کیوان کی خدمت میں پہنچا اور اس سے مقامات سلوک تحصیل کیے۔ اس کی تصنیفات سے بزمگاہ ایک مفید کتاب ہے جس میں اس نے آذر کیوان کے بارہ شاگردوں کے حالات وواقعات لکھے ہیں۔ ان شاگردوں کے نام یہ ہیں آردشیر' خراد' شیرویہ' خردمند' فرہاد' سہراب' ازادہ' بیژن' اسفندیار' فرشیدورد' بہمن' رستم' مصنف دبستان نے آذر کیوان کے شاگردوں کے حالات زیادہ تر اسی کتاب سے لکھے ہیں۔

بہرام بن فرشاد

ارژنگ مانی اس کی تصنیف ہے آذر کیوان کا شاگرد تھا لیکن تکمیل بہرام کی خدمت میں کی۔ سنہ ۱۰۴۸ھ میں بمقام لاہور وفات پائی شیخ شہاب الدین مقتول سہروردی کی تصنیفات جو فلسفہ اشراق کے متعلق تھیں ان کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ عربی' فارسی اور ہندی کے علاوہ یورپ کی بعض زبانیں بھی جانتا تھا۔ اکثر کتابت کا شغل رکھتا تھا۔ اور نہایت قلیل الغذا تھا۔ مصنف دبستان کا بیان ہے کہ میں نے ۱۰۴۸ھ میں اس کو لاہور میں دیکھا تھا۔ ایک رات متصل دوزانو ایک مقام پر بیٹھا رہا اور ذرا جنبش نہ کی۔

موبد پرستار

پٹنہ میں پیدا ہوا۔ بچپن میں آذر کیوان کی صحبت اٹھائی اور زیادہ تر فیض موبد سروش سے حاصل کیا۔ پترہ سوبدی اس کی تصنیف ہے۔

شیدوش بن انوش

زردشت کے خاندان سے تھا۔ اس کا باپ آذر کیوان کا تربیت یافتہ تھا نہایت خوش لباس تھا۔ اور بڑے کروفر سے زندگی بسر کرتا تھا۔ خوبرو اور وجیہ تھا سنہ ۱۰۴۰ھ میں کشمیر میں بیمار ہوا اور یہیں وفات پائی نزع کی حالت میں حضرت نور بخش کے یہ اشعار پڑھنے شروع کر دیے:

یکے قطرہ از محیط وجود
اگر چند داریم کشف و ستود
من از قطرہ کے گشتہ ام بس نفور
خدایا رسانم بہ دریائے نور

اخیر شعر پر دم نکل گیا۔

مصنف دبستان نے اس کا مرثیہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں:

شیدوش تازہ دیدہ من برکرا نہ شد
گر چشم خانہ بود بہ سرود خانہ شد

آرام گاہ طائر قدسی سپہر بود

زین پست آشیان بہ فراز آشیانہ شد

جانش بہ ذات حضرت جان آفریں رسید

بیرون زقید چرخ و زمین زمانہ شد

یہ تمام موبد جن کا ذکر ہوا' آذر کیوان کے شاگرد اور تربیت یافتہ تھے۔

مصنف دبستان نے اور موبدوں کے نام بھی لکھے ہیں ہم نے ان کو قلم انداز کیا۔

مسلمانوں کی بے تعصبی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ بہت سے مسلمان فضلاء نے آذر کیوان کی شاگردی اختیار کی اور چونکہ وہ موحد اور صوفی تھا اس لیے سلوک کے مقامات اس سے طے کیے۔ان میں سے محمد علی شیرازی' محمد سعید اصفہانی' عاشور بیگ' محمود بیگ کا حال مصنف دبستان نے تفصیل سے لکھا ہے۔لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ شیخ بہاؤالدین عاملی نے بھی آذر کیوان کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا سچ ہے:

ہیچ کہ ذوق طلب' از جستجو بازم نہ داشت

دانہ می چیدم من آن روزے کہ خرمن داشتم

(الندوہ جلد ۲ نمبر ۶)

ستمبر سنہ ۱۹۰۵ء

☆☆☆

زیب النساء

بمبئی کے سفر میں ایک عزیز دوست جو انگریزی تصنیفات پر زیادہ اعتماد رکھتے ہیں۔ انڈین میگزین اینڈ ریویو کا ایک آرٹیکل دکھلایا جو زیب النساء کی سوانح العمری کے متعلق تھا۔ مجھ کو افسوس ہوا کہ ایک ایسے معزز پرچہ کا سرمایہ معلومات تمام تر بازاری قصے تھے جس میں سے ایک شرمناک قصہ عاقل خان رازی کا بھی ہے۔اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ خود مسلمانوں میں بازاری اہل قلم نے زیب النساء کے جو حالات تجارتی غرض سے قلمبند کیے ہیں وہ بالکل بے سروپا ہیں۔اس بنا پر خیال ہوا کہ زیب النساء کے متعلق صحیح معلومات یکجا کر دیے جائیں موصوف الذکر دوست نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس کو انگریزی میں منتقل کر دیں گے۔جس سے یہ فائدہ ہوگا کہ غلط معلومات کی اصلاح ہو جائے گی۔

انگریزی مصنفوں کی غلطیاں جو عالمگیر ہو جاتی ہیں۔اس کی یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص ان کی پردہ دری نہیں کرتا اور کرتا ہے تو ایسی زبان میں جس ی ان کو خبر تک نہیں ہوتی۔اس لیے سلسلہ بہ سلسلہ وہ غلطیاں پھیلتی جاتی ہیں اور ان سے مسلمانوں اور عادات کی نسبت نہایت برے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔

ایک عزیز دوست کی خاطر سے مجھ کو اپنے دائرہ تحریر سے ہٹنا پڑا ہے۔لیکن میں اس بے اصولی سے شرمندہ نہیں ہوں۔

زیب النساء کی ولادت

زیب النساء اورنگ زیب کی سب سے پہلی اولاد تھی۔ اس کی ماں جس کا نام دلرس بانو بیگم تھا شاہ نواز خان صفوی کی بیٹی تھی۔ شاہ نواز کا اصلی نام بدیع الزمان ہے۔ جہانگیر کے زمانے میں معزز عہدوں پر ممتاز ہو کر شاہ نواز خان کے خطاب سے ملقب ہوا۔ شاہجہان کے زمانے میں بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیے چونکہ لیاقت ذاتی کے ساتھ عالی خاندان بھی تھا۔ شاہجہان نے سنہ ۱۰۴۷ھ میں یہ کہ اس کی سلطنت کا دسواں سال تھا' اورنگ زیب کی شادی اس کی بیٹی سے کردی۔ چار لاکھ مہر باندھا گیا۔ طالب کلیم نے مادہ تاریخ کہا

دو گوہر ب یک عقد دوراں کشیدہ [1]

زیب النسا کی شادی کے دوسرے سال شوال سنہ ۱۰۴۸ھ میں پیدا ہوئی۔ عالمگیری امرا میں عنایت اللہ خان نہایت معزز عہدہ دار تھا۔ اس کی مان حافظہ مریم قابل اور تربیت یافتہ تھی۔ زیب النساء جب پڑھنے کے قابل ہوئی تو اورنگ زیب نے اس کی تعلیم کے لیے حافظہ مریم کو مقرر کیا۔ جس نے حسب دستور سب سے پہلے قرآن مجید کی تعلیم دی [2]۔ زیب النسا نے قرآن مجید حفظ یاد کیا جس کے صلہ میں اورنگ زیب نے تیس ہزار اشرفیاں انعام میں دیں [3]

تمام تاریخیں اور تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ زیب النساء نے عربی اور فارسی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی حاصل کی تھی۔ اور بڑے علماء اور فضلا اس کی خدمت میں رہتے تھے لیکن اس کے اساتذہ میں سے زیادہ مقرب اور

---

[1]۔ مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۶۷۰ [2]۔ مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۸۲۸ [3]۔

مآثر عالمگیری صفحہ ۵۳۸۔

بار یاب ملا سعید اشرف ماژندارئی تھے۔ ملا سعید تقی مجلسی کے نواسے تھے۔ عالمگیر کے آغاز جلوس میں ایران سے آئے اور عالمگیر کو ان کو زیب النساء کی تعلیم کے لیے مقرر کیا ا۔ اس وقت زیب النساء کی عمر قریبا اکیس برس کی تھی۔ اس سے قیاس ہوسکتا ہے کہ تیموریوں کی مستورات کی تعیم کا سلسلہ کس قدر ممتد ہوتا تھا۔ زیب النساء نظم و نثر میں ملا سعید ہی سے اصلاح لیتی تھی۔

ملا اشرف شاعر بھی تھے اور شاعری ہی کے وصف سے مشہور ہیں۔ قریباً ۱۳۔۱۴ برس وہ تعلیم کے تعلق سے زیب النساء کی خدمت میں رہے۔ سنہ ۱۰۸۳ میں وطن جانا چاہا زیب النساء کی خدمت میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا جس میں رخصت کی درخواست کو اس طرح ادا کیا گیا تھا:

یک بار از وطن نتواں برگرفت دل
در غربتم اگرچہ فزون ست اعتبار
پیش تو قرب و بعد تفاوت نمی کند
گو خدمت حضور بنا شد مرا شعار
نسبت چو باطنی است چہ دہلی چہ اصفہان
دل پیش تست من چہ بہ قابل چہ قندہار[۲]

زیب النساء نے جس قسم کی تعلیم پائی تھی اور خود اس انداق طبیعت جس قسم کا واقع ہوا تھا اس کے لحاظ سے وہ پالیٹکس سے بالکل ناآشنا تھی۔ تاہم عالمگیر کے پر پیچ عہد حکومت میں وہ بھی اس بدنامی سے بچ نہ سکی۔ سنہ ۱۰۹۱ھ میں راجپوتوں نے جب عام بغاوت کی اور

عالمگیر نے ان کے دبانے کے لیے شہزادہ اکبر کو فوج گراں دے کر جودھ پور کی طرف روانہ کیا تو راجپوتوں کے بہکانے سے شہزادہ خود باغی ہوگیا اور عالمگیر کے مقابلہ کو بڑھا۔ شہزاد النساء اور شہزادہ اکبر حقیقی بہن بھائی تھے۔ دونوں میں خط و کتابت بھی تھی۔ یہ خطوط پکڑے گئے اور عالمگیر نے اس کے انتقام میں زیب النساء کی تنخواہ جو چار لاکھ سالانہ تھی بند

۱۔ سروآزاد تذکرہ ملا اشرف ۲۔ ایضاً

کردی۔ اس کے ساتھ تمام مال و متاع ضبط کرلیا گیا اور قلعہ سلیم گڑھ میں رہنے کا حکم ہوا[۱]۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد اس کی بے گناہی ثابت ہوگئی اور عفو قصور کر دیا گیا کیونکہ سنہ ۱۰۹۴ھ میں جب حمیدہ بانو بیگم (والدہ روح اللہ خان) نے انتقال کیا تو رسم تعزیت ادا کرنے کے لیے عالمگیر نے زیب النساء کو روح اللہ خان کے گھر بھیجا۔ اسی سنہ میں شہزادہ کام بخش (عالمگیر کا سب سے چھوٹا بیٹا) کی شادی ہوئی تو تقریب کی رسمیں زیب النساء ہی کے محل میں ادا ہوئیں اور عالمگیر کے حکم سے تمام ارکان دربار زیب النساء کی ڈیوڑھی تک پاپیادہ گئے۔

زیب النساء نے شادی نہیں کی۔ عام طور پر مشہور ہے کہ سلاطین تیموریہ لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے۔ اس غلط روایت کو یورپین مصنفوں نے بہت شہرت دی ہے۔ اور اس سے ان کو شاہی بیگمات کی بدنامی پھیلانے میں بہت مدد ملی ہے۔ لیکن یہ قصہ ہی سرے سے بے بنیاد ہے۔ خود عالمگیر کی دو بیٹیاں زبدۃ النساء بیگم اور مہر النساء بیگم سپہر شکوہ اور ایزد بخش (پسر شہزادہ مراد) سے بیاہی تھیں۔ چنانچہ مآثر عالمگیری میں دونوں شادیوں کی تاریخیں اور مختصر حالات لکھے ہیں اور خاتمہ کتاب میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

عالمگیر زیب النساء کی نہایت عزت کیا کرتا تھا۔ جب وہ کہیں باہر سے آتی تھی تو اس کے استقبال کے لیے شہزادوں کو بھیجتا۔ سفر و حضر میں اس کو ساتھ رکھتا تھا۔ کشمیر کے دشوار سفر میں بھی وہ ساتھ تھی۔ لیکن جب عالمگیر دکن گیا تو اس نے غالباً اپنی علی زندگی کی وجہ سے پائے تخت کو چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی چھوٹی بہن زینت النساء عالمگیر کے ساتھ گئی۔ چنانچہ اس کا بار بار نام واقعات میں آتا ہے۔ زیب النساء نے دلی میں قیام کیا اور وہیں پیوند زمین

۱۔ مآثر عالمگیری صفحہ ۲۰۴

ہوگئی۔ زیب النساء نے سنہ ۱۱۱۳ھ میں جو عالمگیر کی حکومت کا اڑتالیسواں سال تھا، دلی میں انتقال کیا۔ ادخلی جنتی مادہ تاریخ ہے۔

عالمگیر اس زمانے میں دکن کی فتوحات میں مصروف تھا۔ یہ خبر سن کر سخت غمزدہ ہوا بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکلے اور باوجود انتہا درجہ کے استقلال مزاج کے صبر کی تاب نہ لا سکا۔ سید امجد خان، شیخ عطا اللہ اور حافظ خان کے نام حکم صادر ہوا کہ اس کے ایصال ثواب کے لیے زکوۃ و خیرات دیں اور مرحومہ کا مقبرہ تیار کرائیں۔ [۱]

خانی خان نسخہ مطبوعہ کلکتہ میں زیب النساء کا نام اور اس کے واقعات سنہ ۱۱۲۲ھ تک آتے ہیں۔ لیکن یہ صریحی غلطی ہے۔ کاتبوں نے غلطی سے زینت النساء کو زیب النساء سے بدل دیا ہے۔

کمالات علمی اور عام اخلاق و عادات

تمام مورخین نے بہ تصریح لکھا ہے کہ زیب النساء علوم عربیہ اور فارسی زباندانی میں کمال رکھتی تھیں۔ نستعلیق نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھیں۔ لیکن اس کی تصنیفات سے آج کوئی چیز موجود نہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ مخفی تخلص کرتی تھی اور دیوان مخفی جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے اسی کا ہے لیکن یہ صحیح نہیں کسی تاریخ یا تذکرہ میں اس کے تخلص یا دیوان کا ذکر نہیں مولوی غلام علی آزاد ید بیضا میں لکھتے ہیں کہ این دو بیت از نام او مسموع شدہ پھر دو شعر نقل کیے ہیں۔ اس کا دیوان ہوتا تو صرف دو شعر کا کیوں ذکر کرتے مخزن العرائب ایک تذکرہ ہے جو احمد علی سندیلوی کی تصنیف ہے مصنف نے نہایت کثرت سے فارسی تذکرے بہ پہنچائے ہیں اور ان سے حالات اور اشعار انتخاب کیے ہیں۔ زیب النساء کے حال میں لکھتے ہیں:

۱۔ مآثر عالمگیری صفحہ ۴۶۲

''اما دیوان اشعارش جائے بہ نظر نیامدہ مگر در تذکرہ انتخابش
بہ نظر آمدہ لیکن اعتبار را نشاید' سبب آن کہ اکثر شعرا ساتذہ' صاحب
آن تذکرہ بنام بیگم نوشتہ بود''۔

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ شاعر تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام ضائع ہو گیا۔ اسی تذکرہ میں ملا سعید اشرف کے حال میں لکھا ہے کہ زیب النساء کی بیاض خاص ایک خواص کے ہاتھ سے جس کا نام ارادت بہم تھا۔ حوض میں گر پڑی۔ چنانچہ سعید اشرف نے اس پر ایک قطعہ لکھا جو آگے آئے گا۔ غالباً یہ اشعار کی بیاض ہوگی تذکروں میں یہ دو شعر زیب النساء کے نام منقول ہیں:

بشکنند دستے کہ خم در گردن یارے نشد
کورِبہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد
صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت
غنچہ باغ دل مازیب دستارے نشد

زیب النساء کی تصنیفات وتالیفات سے زیب المنشاات کا ذکر البتہ تذکروں میں آیا ہے تذکرۃ الغرائب کے مصنف نے لکھا ہے کہ ''میں نے اس کو دیکھا ہے'' یہ زیب النساء کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ ہے۔

علم پروری

زیب النساء نے خود کوئی تصنیف کی ہو یا نہ کی ہو لیکن اس نے اپنی نگرانی میں اہل فن سے بہت سی عمدہ کتابیں تصنیف کرائیں۔ مولوی غلام علی آزاد ید بیضا میں لکھتے ہیں:

''ہمت بہ ترقیہ حال ارباب فضل وکمال مصروف می داشتہ و جماعت کثیر از علماء وشعراء ومنشیان وخوشنویسان بہ سایہ قدردانی او آسودہ بودند وکتب ورسائل بسیار بنام اور سمت تالیف پذیرفتہ''۔

زیب النساء کا دربار حقیقت میں ایک اکاڈیمی (بیت العلوم) تھی۔ ہرفن کے علماء اور فضلاء نوکر تھے جو ہمیشہ تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے تھے۔ یہ کتابیں عموماً اس کے نام سے موسوم ہوتی تھیں۔ یعنی ان کتابوں کے نام کا پہلا جز زیب النساء کا لفظ ہوتا تھا اس سے اکثر تذکرہ نویسوں کو دھوکا ہوا ہے۔ اور انہوں نے وہ کتابیں زیب النساء کی تصنیفات میں شمار کیں۔

زیب النساء نے جو کتابیں تصنیف کرائیں ان میں زیادہ قابل ذکر تفسیر کبیر کا ترجمہ ہے یہ مسلم ہے کہ تفسیروں میں امام رازی کی تفسیر سے زیادہ جامع تفسیر اور کوئی نہیں اس لیے زیب النساء نے ملا صفی الدین اردبیلی کو جو کشمیر میں مقیم تھے حکم دیا کہ اس کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ چنانچہ اس کا نام زیب التفاسیر رکھا گیا بعض تذکرہ نویسوں نے غلط لکھ دیا ہے کہ وہ زیب النساء کی مستقل تصنیف ہے۔

زیب النساء نے تصنیف و تالیف کا جو محکمہ قائم کیا تھا اس کے ساتھ ایک عظیم الشان کتب خانہ کا ہونا بھی ضرور تھا۔ جس سے مصنفین فائدہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ بیگم موصوف نے ایک نہایت عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا۔ مصنف مآثر عالمگیری کا بیان ہے کہ اس کتب خانہ کی نظیر کسی کی نظر سے نہ گزری ہوگی۔ مصنف مذکور کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

''درسرکار علیہ کتابخانہ گرد آمدہ بود کہ بہ نظر ہیچ یکے در نیامدہ باشد۔ (صفحہ ۵۳۹)''

زیب النساء کے حسن مذاق سے بڑا نفع یہ ہوا کہ عالمگیر کی خشک مزاجی نے جو نقصان پہنچایا تھا اس کی تلافی ہوگئی۔ یاد ہوگا کہ دربار میں ملک الشعراء کا خاص عہدہ ابتدائے سلطنت سے چلا آرہا تھا جس پر فیضی، طالب آملی، قدسی کلیم مامور رہ چکے تھے۔ عالمگیر نے اس عہدہ کو موقوف کر دیا اور دفعتہً شعرا گویا بے خان و مان ہوگئے لیکن زیب النساء کی قدردانی نے وہ پھر سے قائم کر دیا۔ مختلف تقریبوں پر شعرا قصیدے اور نظمیں لکھ کر پیش کرتے تھے اور گراں بہا انعام پاتے تھے۔ زیب النساء کی شعر دوستی کا یہ اثر ہوا کہ اہل سخن معمولی غرض و معروض سے بھی شعر ہی میں کرتے تھے۔ اس قسم کے چند واقعات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ ارادت فہم نام ایک خاص کے ہاتھ سے زیب النساء کی بیاض

خاص حوض میں گر پڑی تھی۔ اس جرم کی معافی کے لیے ملا سعید اشرف نے یہ قطعہ لکھ کر پیش کیا۔

اے ادا فہمے کہ پیشت فاضلان عصر را
شستن مجموعہ اندیشہ باب افتادہ است
درخم افلاطون زیاد دانشت سر خوش بود
ہمچو مخمورے کہ در فکر شراب افتادہ است
گاہ گاہے گزرے آدابی باد صبا
از گل روئے عرقناکت نقاب افتادہ است
آب حسرت در دہان اختراں گردیدہ است
آتش غیرت بہ جان آفتاب افتادہ است
ذہن صافت عا علم فرویدہ در دانشوری
طبع افلاطون زبس در اضطراب افتادہ است
دفتر فرہنگ در چنگش مجزا گشتہ است
از کفش مجموعہ دانش در آب افتادہ است
عرض حالے ہست رد خاطر کہ در اظہار آں
بند بندم موج ساں در اضطراب افتادہ است
آں بیاض خاصہ شاہی کہ دراطراف آں
جائے افشاں نقطہائے انتخاب افتادہ است
آں مرصع خواں گہر ریزی کہ باشد جلوہ گر
در الفاظش لبی با آب و تاب افتادہ است

نے ہمین ازیاد معدن رفت لعل آبدار
گوہر غلطاں ہم از چشم سحاب افتادہ است
بحر شعر آبدارش تازہ طوفاں کردہ است
کشتیش درچار موج اضطراب افتادہ است
گوئیا از سر بدر رفت ست آب جدولش
کاین چنین گلزار اشعارش خراب افتادہ است
آہ ازین غم در دل پیرو جوان پیچیدہ است
لرزہ زین ہیبت بجاں شیخ و شباب افتادہ است
بسکہ می بندند ہریک بر بلوئے دیگرے
گریباض گردنش خوانن تاب افتادہ است
من چہ گویم کان چومژگان خودش برگشتہ بخت
در تپ این غم چناں از خورو خواب افتادہ است
زاں زماں باز از پریشان حالی و آشفتگی
ہمچو زلف خویشتن درپیچ و تاب افتادہ است
رفت رنگ آتشین چوں شمع صبح از عارخش
ہمچو نبض موج اندر اضطرات افتادہ است
فیض بخشا زور شر پروانہ ، بخشا یشے
کاتشے در وے چو شمع از التہاب افتادہ است
درنہ خواہی دید ، یکدم دفتر افلاک را
از ہجوم گریہ اش یکسر خراب افتادہ است!

نعمت خان عالی، اس زمانے کا مشہور شاعر تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایک مرصع کلغی جو دستار پر لگاتے تھے۔ زیب النساء کی خدمت میں فروخت کے لیے پیش کی زیب النساء نے رکھ لی۔ لیکن جیسا کہ درباروں کا معمول ہے قیمت کے ملنے میں دیر ہوئی۔ نعمت خان نے یہ رباعی لکھ کر بھیجی:

اے بند گیت سعادت اختر من
درخدمت تو عیان شدہ جوہر من
گر جیغہ خریدنی است کور زمن
درنیست خریدنی ابزن برسر من
اگر خریدنا ہے تو دام دلوایئے
اور نہ خریدنا ہو تو میرے سر پر ماریے

بیگم نے پانچ ہزار روپے دلوائے اور کلغی واپس کردی۔[۲]

ملا سعید اشرف جو زیب النساء کا استاد تھا اور زیب النساء نظم ونثر میں اسی سے اصلاح لیتی تھی بڑے پایہ کا شاعر تھا۔ تمام تذکروں میں اس کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ بیگم اس کو بہت عزیز رکھتی ہے۔ ایک دفعہ اس نے ایک لونڈی ملا صاحب کے پاس بھیجی کہ اس کو خدمت میں رکھیے۔ کنیز ملا صاحب کے مذاق کے موافق نہ تھی۔ ایک طویل قطعہ اس کی ہجو میں لکھ کر بیگم کو بھیجا۔ آغاز کا شعر یہ تھا:

قدر دانشور سنا نور چشم عالما
اے کہ ہرگز قدرت ہم چشمیت حور نداشت

مولوی غلام علی آزاد نے صرف یہی ایک شعر نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس مین قاب قوسین او ادنیٰ کا قافیہ فحش موقع پر استعمال کیا تھا۔ لیکن یہ نہایت

ا۔ یہ تمام اشعار تذکرہ مجمع الغرائب اشرف سعید کے حالات میں نقل کیے گئے ہیں

۲۔ خزانہ عامرہ تذکرہ نعمت خان عالی۔

تعجب کی بات ہے زیب النساء تو زاہدانہ مذاق رکھتی تھی شاہی بیگمات کے دربار میں کسی کو اس قسم کی بے اعتدالی کی جرات نہیں ہوسکتی تھی۔ جہاں آراء بیگم (زیب النساء کی پھوپھی) ایک دفعہ باغ میں سیر کو نکلی۔ ہر طرف پردہ کرادیا گیا۔ میر صیدی طہرانی ایک مشہور شاعر تھا۔ وہ کسی حجرہ میں چھپ کر سواری کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ بیگم کا ہاتھی پاس سے گزرا تو بے ساختہ صیدی نے یہ مطلع پڑھا۔

برقع برخ افگندہ برد ناز بہ باغش
تا نکہت گل بیختہ آید بہ دماغش

باغ میں برقع پہن کر اس لیے جاتی ہے
کہ پھول کی خوشبو چھن کر دماغ میں آئے

بیگم نے حکم دیا کہ شاعر کو کشاں کشاں سامنے لائیں۔ بیگم نے بار بار مطلع پڑھوا کر سنا اور پانچ ہزار روپے دلوائے لیکن ساتھ ہی حم دیا کہ شہر سے نکال دیا جائے[1]۔ یعنی یہ گستاخی کیوں کی۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ بیگمات کے لیے کس قسم کے آداب مقرر تھے۔

اخلاق و عادت

زیب النساء اگرچہ درویشانہ اور مصنفانہ مذاق رکھتی تھی تاہم شاہجہان کی پوتی تھی اس

لیے نفاست پسندی اور امارت کے سروسامان بھی لازمی تھے۔عنایت اللہ خان جو امرائے عالمگیری مین مقرب خاص تھا' زیب النساء کا میر خانساماں۲ تھا۔کشمیر میں جا بجا خوشگوار اور خوش منظر چشمے ہیں ان میں سے ایک چشمہ کا نام احول تھا زیب النساء کی جاگیر میں تھا۔ زیب النساء نے اس کے متصل ایک نہایت پر تکلف باغ اور شاہانہ عمارتیں تیار کرائی تھیں۔ چنانچہ عالمگیر جب سنہ ۱۰۷۳ھ میں کشمیر کے سفر کو گیا ہے تو اس مقام پر ایک دن قیام کیا اور زیب النساء نے قاعدہ کے موافق نذر پیش کی اور روپے نچھاور

۱۔ خزانہ عامرہ ذکر صیدی طہرانی ۲۔ مآثر الامراء جلد دوم تذکرہ عنایت اللہ خان صفحہ ۸۲۹۔

کیے۱۔

سنہ ۱۰۹۰ھ میں ابرک کا ایک بڑا خیمہ تیار کرایا تھا جو تمام تر شیشہ معلوم ہوتا تھا۔نعمت خان عالی نے اس کی تعریف میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

ازان جز گاہ طلقش چشم بددور
کہ شد از جلوہ اش نور علیٰ نور
تعالیٰ اللہ چہ روشن بارگاہے
کدورت رادرین جانیست راہے
زنورش گشتہ خیرہ چشم کوکب
کمینہ خانہ زادش ماہ نخشب

فرو غش گر چنین دارد جہاں تاب
کسے شب رانخواہد دید در خواب
چو عاجز گشت نطقم از ثنایش
شدم جو یائے تاریخ بنایش
پیے تاریخ آن گفتا زمانہ
برزنگ دلم آئینہ خانہ

بھائیوں سے نہایت محبت رکھتی تھی۔سنہ ۱۱۰۵ھ میں جب اعظم شاہ مرض استسقا میں سخت بیمار ہوا تو زیب النساء نے اس کی تیمارداری اس محبت سے کی کہ تمام ایام مرض تک اس پرہیزی غذا کے سوا جو شہزادہ کھاتا تھا کوئی اور غذا نہیں کھائی ۲۔محمد اکبر جس زمانے میں عالمگیر سے باغی ہو کر راجپوتوں سے مل گیا اس زمانے میں بھی زیب النساء نے اس سے برادرانہ راہ ورسم اور خط وکتابت ترک نہ کی۔جس کے صلے میں اس کی تنخواہ اور جاگیر ضبط ہو گئی۔

زیب النساء کے متعلق جھوٹے قصے

زیب النساء کے متعلق متعدد جھوٹے قصے مشہور ہو گئے ہیں جن کو یورپین مصنفین نے اور زیادہ آب ورنگ دیا ہے۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ زیب النساء اور عاقل خان میں عاشق اور معشوقی کا تعلق تھا۔اور زیب النساء اس کو چوری چھپے

ے ا۔ عالمگیر نامہ مطبوعہ کلکتہ ص ۸۳۶ ے ۲۔ مآثر الامراء جلد اول ص ۵۹۹ مآثر عالمگیری میں زیب النساء کے بجائے اینت النساء کا نام لکھا ہے لیکن یہ وہی لفظی اشتباہ

ہے۔

سے محل میں بلایا کرتی تھی۔ ایک دن عالمگیر محل میں موجود تھا کہ اس کو پتہ لگا کہ عاقل خان محل میں ہے اور حمام کی دیگ میں چھپا دیا گیا ہے۔ عالمگیر نے انجان بن کر اسی دیگ میں گرم پانی کرنے کا حکم دیا۔ عاقل خان نے اخفائے راز سے دم نہ مارا اور جل کر رہ گیا۔ مرنے کے وقت یہ مطلع کہا تھا:

بعد مردن زجفائے تو اگر یاد کنم
از کفن دست بردن آرم فریاد کنم

عاقل خان کا مفصل تذکرہ مآثر الامراء میں موجود ہے اور چونکہ شاعر تھا تمام تذکروں مُں اس کے حالات مذکور ہیں۔ لیکن اس واقعہ کا کہیں نام ونشان نہین جن کتابوں میں اس کا حال مل سکتا تھا اور جو مستند اور معتبر خیال کی جاتی ہیں حسب ذیل ہیں عالمگیر نامہ' مآثر عالمگیری ' مآثر الامراء' تذکرہ سرخوش' خزانہ عامرہ' سرد آزاد' ید بیضا۔ ان کتابوں میں ایک حرف بھی اس واقعے کے متعلق نہیں۔ حالانہ اس کی وفات کا تذکرہ سب نے لکھا ہے جو سنہ ۱۱۰۷ھ میں واقع ہوئی۔

دوسرا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ زیب النساء نے یہ مصرع کہا:

از ہم نمی شود زحلاوت جدالبم

چاہتی تھی کہ مطلع ہو جائے لیکن دوسرا مصرع اس کی جوڑ کا موزوں نہیں ہوتا تھا ناصر علی کے پاس مصرع لکھ کر بھیجا اس نے برجستہ کہا۔

از ہم نمی شود ز حلاوت جدالبم
شاید رسید برلب زیب النسا لبم

لیکن جو شخص تیموریوں کے جاہ وجلال اور آداب وآئین سے واقف ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ بیچارے ناصر علی کو خواب میں بھی اس گستاخی کی جرات نہیں ہو سکتی تھی۔

(الندوہ جلد ۶ نمبر ۹)

اکتوبر سنہ ۱۹۰۹ء

☆☆☆

مولوی غلام علی آزاد بلگرامی

دلی اور لکھنو میں جو مساویانہ رقابت قائم کردی گئی ہے وہ اور کسی اعتبار سے صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ایک خاص بات میں (اور یہ کوئی معمولی بات نہیں) لکھنو ہندوستان کے تمام شہروں سے ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ وہ یہ کہ اس کے اطراف و جوانب میں مردم خیز بستیاں ہیں انہوں نے جس درجے کے علماء پیدا کیے دلی ایک طرف کل ہندوستان نے اس پایہ کے اہل کمال پیدا نہیں کیے۔ ملا قطب الدین شہید' ملا نظام الدین بحر العلو' حمد اللہ' ملا حسن' ملا کمال قاضی مبارک جو آسمان علم کے ثوابت اور سیارے ہیں۔ انہی بستیوں کے خاک کے اٹھے تھے۔ سہالی' گوپامئو' نیوتنی' موہان' گو خود عالم شہرت میں روشناس نہیں لیلکن انہوں نے جو علمی جواہر پیدا کیے آج تمام ہندوستان ان کے نام سے گونج رہا ہے۔ انہی مردم خیز بستیوں میں ایک بلگرام بھی ہے جو آج علمی حیثیت سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ مولوی غلام علی آزاد جن کا مختصر حال ہم لکھنا چاہتے ہیں یہیں کے رہنے والے تھے۔

بلگرام میں جس قدر رواسطی سادات آباد ہیں ان کے مورث اعلیٰ جو بلگرام میں آ کر آباد ہوئے سید محمد صغری ہیں۔ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید تھے اور سلطان شمس الدین التمش کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ سنہ ۶۱۴ھ اس زمانے میں بلگرام پر ایک ہندو راجہ قابض تھا جس کا نام سری تھا۔ اور جو نہایت متعصب اور سرکش تھا۔ سنہ ۶۱۴ھ میں سید محمد صغری اس کی سرکوبی کے لیے تھوڑی سی فوج لے کر روانہ ہوئے اور بلگرام پہنچ کر راجہ سے معرکہ آراء ہوئے۔ راجہ مع عزیز و اقارب کے قتل ہوا۔ اور بلگرام پر پورا پورا تسلط ہو گیا۔ اس

واقعہ کی تاریخ خداداد کے لفظ سے نکلتی ہے۔

سید محمد صغری نے یہیں اقامت اختیار کی۔شیوخ فرشوری اور ترکمان جوان کے ساتھ آئے تھے وہ بھی یہیں آباد ہو گئے۔اس زمانے میں مالگزاری کا طریقہ یہ تھا کہ غلہ کی پیداوار کا دسواں حصہ لیا جاتا تھا جس کو وہ یکی کہتے ہیں چنانچہ محمود بن محمد شاہ بن سلطان فیروز شاہ دہلی کے فرمان کی جو عبادت مولوی غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں نقل کی ہے اسکے یہ الفاظ ہیں:

''چنانچہ در عہد سلاطین ماضیہ عشر عین غلہ دادہ اند ہم برآن جملہ بدہند''۔

یہ فرمان سنہ ۸۰۵ھ کا ہے جو سید محمد صغری کے نام سے صادر ہوا تھا۔

سید محمد صغری نے بلگرام میں ایک قلعہ تعمیر کیا اور ۳۱ برس کی حکومت کے بعد سنہ ۶۴۵ھ میں وفات پائی۔مولوی غلام علی آزاد انہی سید محمد کی اولاد میں سے ہیں۔

مولوی غلام علی آزاد روش یکشنبہ ۲۵ صفر سنہ ۱۱۱۶ھ میں بمقام بلگرام محلّہ میدان پورہ میں پیدا ہوئے کتب درسیہ میر طفیل محمد بلگرامی سے پڑھیں جو اس زمانے کے مشہور فاضل تھے۔عروض وقافیہ اور بعض ادب کی کتابیں میر سید محمد سے پڑھیں جو آزاد کے ماموں اور سید عبدالجلیل کے فرزند رشید تھے۔اس زمانے میں سید عبدالجلیل بلگرامی (آزاد کے نانا) اساتذہ روزگار میں شمار کیے جاتے تھے۔وہ ۱۶ برس کی سیر وسیاحت وملازمت سلطنت کے بعد وطن میں آئے۔اس وقت آزاد کی عمر ۱۷ برس کی تھی۔یہ پہلا موقع تھا کہ آزاد نے ایسے نامور یگانہ دیدار سے آنکھیں روشن کیں۔آزاد نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوے شاگردی تہہ کیا اور کتب احادیث کی اجازت حاصل کی سنہ ۱۱۳۴ھ میں سید عبدالجلیل نے پھر دلی کا رخ کیا چونکہ آزاد کی تکمیل کے مراحل ابھی طے نہیں ہوئے تھے یہ بھی ساتھ گئے اور دو

برس تک ان کی خدمت میں رہ کر استفادہ کیا۔ قاموس اللغہ کا معتد بہ حصہ اور حدیث سے ا
سقدر خوش ہوئے کہ اکثر کہا کرتے تھے کہ امید ہے تم سے میری یادگار قائم رہ جائے۔ فراغ
تحصیل کے بعد وطن میں واپس آئے اور مدت تک یہیں رہے۔

سنہ ۱۱۴۲ھ میں سندھ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ تقریب یہ ہوئی کہ ان کے ماموں میر سید
محمد اس زمانے میں بادشاہ دہلی کی طرف سے سندھ کے میر بخشی اور وقائع نار تھے اور
سیوستان جو سندھ کا ایک شہر ہے ان کا صدر مقام تھا۔ ان سے ملنے کے لیے بلگرام سے نکلے
اور دلی لاہور اور ملتان ہوتے ہوئے سیوستان پہنچے۔ اس زمانے کے سفر کی دشواریوں پر
خیال کرو کہ ذی الحجہ سنہ ۱۱۴۲ھ میں بلگرام سے روانہ ہوئے تھے اور ربیع الاول سنہ ۱۱۴۳ھ
میں سیوستان پہنچے یعنی یہ مسافت ایک برس تین مہینے میں ختم ہوئی۔ میر سید محمد نے ان کو اپنا
قائم مقام کر کے خود بلگرام کا قصد کیا۔ اور پورے چار برس کے بعد واپس آئے۔ آزاد سنہ
۱۱۴۷ھ میں سیوستان سے دلی میں آئے یہاں خبر لگی کہ ان کے والد ماجد مع تمام اہل وعیال
الہ آباد میں تشریف رکھتے ہیں۔ یہ سن کر آگرہ ہوتے ہوئے الہ آباد پہنچے۔ والدین سے مل کر
سعادت دارین حاصل کی اور چند روش یہیں قیام رہا۔ اس قیام کے زمانے میں دو دفعہ
بلگرام گئے۔ دوسری دفعہ جا کر واپس آئے تو سفر حج کا شوق دامن گیر ہوا بچپن میں کبھی
خواب دیکھا تھا کہ جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا شرف حاصل ہوا ہے یہ
آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی یہاں تک کہ ضبط نہ ہو سکا اور ۳ رجب

لے ا۔ مآثر الاکرام تذکرہ سید عبدالجلیل بلگرامی

سنہ ۱۱۵۰ھ میں بے ایتار نکل کھرے ہوئے۔ اگرچہ کبھی پیادہ روی کا اتفاق نہیں ہوا

تھا، لیکن بیتابی شوق میں سواری کا خیال بھی نہ آیا کسی کو خبر تک نہ ہونے دی یہاں تک کہ ان کے چلے جانے کا حال لوگوں کو تیسرے دن معلوم ہوا۔ عورتیں بہت بے قرار ہوئیں ان کے بھائی سید غلام حسن نے تین منزل تک تعاقب کیا مگر یہ ہاتھ نہ آئے۔ مجبوراً واپس آ گئے چونکہ آزاد نے اس خیال سے لوگوں کو پتا نہ لگ جائے معمولی راہ چھوڑ کر غیر متعارف راستہ اختیار کیا۔ اس لیے صحرا نوردی میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ چنانچہ ایک مثنوی میں جو حالات سفر میں لکھی ہے اور جس کا تاریخی نام طلسم اعظم رکھا ہے فرماتے ہیں:

مار خوابیدہ است جادہ او
برنخیزد زپا فتادہ او
پیک این راہ تیر ناوک دار
جامہ از تن کند دم رفتار
رہزنش کاسہ از گدا گیرد
خار او دامن ہوا گیرد
می بریدم رہے بہ بے پائی
بار فیقے کہ بود تنہائی
صبح تا شام راہ می رفتم
خوں چکاں ترز آہ می رفتم
ہمہ کہسار و دشت ناہموار
قدم مورد ایں رہ دشوار
ہر قدم دورہا و جیحون ہا
چوں دم تیغ تشنہ خون را

موج خونناب و جوش آبلہا
ریخت در راہ رنگ سلسلہ ہا

بلگرام سے سرونج تک جو مالوہ کے اضلاع میں ہے پیادہ پا سفر کیا۔نوبت یہ پہنچی کہ پاؤں میں آبلے پڑ گئے اور قدم رکھنا مشکل ہو گیا۔حسن اتفاق یہ کہ نواب آصفجاہ نظام دن مالوے میں فوجیں لیے پڑے ہوئے تھے۔لشکریوں میں سے ایک نیک دل نے ان کے حال سے مطلع ہو کر نہایت فیاض دلی کی' گھر میں لے جا کر مہمان اتارا۔اور ایک پر تکلف رتھ سواری کر دی۔ چونکہ ان کے فضل و کمال کا شہرہ دور دور پہنچ چکا تھا۔نواب آصفجاہ کے دربار میں تقریب ہوئی۔ چنانچہ شعبان سنہ ۱۱۵۰ھ میں حضوری کا موقع حاصل ہوا انہوں نے اگر چہ کبھی تمام عمر امراء کی مدح میں زبان آلودہ نہیں کی۔لیکن سفر حج کے شوق اور بیتابی میں خودداری کا سر رشتہ ہاتھ سے جاتا رہا دربار میں جا کر یہ رباعی پڑھی۔

اے حامی دین محیط جود و احسان
حق داد ترا خطاب آصف شایان
او تخت بہ درگاہ سلیمان آورد
تو آل نبی رابہ در کعبہ رسان

سو اتفاق یہ کہ نواب اس زمانے میں مرہٹوں سے معرکے کر رہے تھے۔اور بھوپال کی حدود میں ہر طرف آتش جنگ مشتعل تھی۔اس وقت مسلمانوں میں عربیت کا اس قدر رواج باقی تھا کہ ان کے ہاتھ قلم کے ساتھ تلوار سے بھی آشنا تھے آزاد نے بھی ان معرکوں میں شرکت کی چنانچہ فخر یہ کہتے ہیں:

من ہم آن زور در صف اسلام
با یکے ذوالفقار خون آشام

قد پر دلانہ افشردم
حملہا بر مخالفان بردم
تشنگیہائے روزہ رمضان
کردہ از کام تاجگر بریان
سفر کعبہ و صیام و جہاد
این سیہ دولت مراہم رو داد

رمضان کے اخیر میں صلح ہوگئی اور نواب نے مطمئن ہوکر آزد کے زادوراحلہ کا معقول بندوبست کردیا۔ شروع شوال میں یہ بھوپال سے نکلے اور برہان پور ہوتے ہوئے ذوقعدہ کو بندسورت میں پہنچے۔ ۲۴ کو جہاز میں سوار ہوئے ۱۸ محرم سنہ ۱۱۵۱ھ کو جدے میں اترے۔ سورت سے جدہ تک کا سفر قریباً دو مہینے میں طے ہوا شیخ محمد فاخر الہ آبدی جو مشہور صوفی اور شاعر گزرے ہیں اس زمانے میں یہیں تھے۔ آزاد کی آمد کی خبر سن کر بڑے اشتیاق سے لینے آئے۔ آزاد جہاز سے اترے تو پہلے ان ہی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے جدہ سے چل کر ۲۳ محرم کو مکہ سے نکلے۔ پورے ایک مہینہ میں مدینہ پہنچے اس وقت ان کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔

شیخ حیات جو سندھ کے رہنے والے تھے اور اس وجہ سے سندی کہلاتے تھے۔ اس زمانے کے بہت برے محدث تھے۔ انہوں نے ہجرت کر کے مدینہ منورہ قیام اختیار کر لیا تھا۔ آزاد نے اس موقع کو نہایت غنیمت سمجھا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوکر صحاح ستہ کی سند لی۔ اکثر راتوں کو مسجد نبوی میں جا کر صحیح بخاری کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے:

نمود جلوہ اعجاز شمع مطلبی

نماند شوخی چشم شرار بولہبی

آٹھ مہینے یہاں قیام رہا ۱۴ شوال کو حج کے ارادے سے روانہ ہوئے اور ۲۶ کو مکہ معظّمہ پہنچے۔ یہاں مناسک ااور اعمال حج کے ساتھ تحصیل عل کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ شیخ عبدالوہاب طنطاوی مصری جو مشہور مہدث گزرے ہیں ان سے حدیث کی تحصیل کی حج کے بعد طائف کا قصد کیا اور مزارات متبرکہ کی زیارت کی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مزار پر حاضر ہوئے تو یہ شعر زبان سے نکلے:

اے صبا رو بہ مزار پسر عم نبی
خاک آں روضہ کم از عنبر تر شناسی
کردہ ام خوب تماشا چمن طائف را
نہ رسد ہیچ گل او بہ گل عباسی

ربیع الثانی سنہ ۱۱۵۲ھ میں طائف سے روانہ ہو کر جدے پہنچے اور ۳ جمادی الاولیٰ کو جہاز پر سوار ہوئے جہاز آٹھویں دن بندرگاہ مخامین پہنچا۔ یہاں شیخ شاذلی کا مزار ہے۔ چونکہ جہاز نے چار دن تک یہاں لنگر کیا۔ یہاں کی خوب سیر کی شاذلی کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ ۲۹ جمادی الاولیٰ کو جہاز بندرگاہ سورت میں پہنچا جدے سے سورت تک کا راستہ ۲۶ دن میں طے ہوا۔

سورت میں پانچ مہینے تک قیام رہا۔ وہاں سے اورنگ آباد میں آئے اور یابا شاہ مسافر نقشبندی کی خانقاہ میں اترے۔ چند روز تک گوشہ نشینی کی لیکن سیاحت کا شوق طبعی تھا۔ دکن کے مختلف مقامات میں پھرتے رہے آخر اورنگ آباد میں مستقل قیام اختیار کیا اور یہیں سنہ ۱۲۰۰ھ میں وفات پائی۔

۱۔ مآثر الکرام شاہ حبیب اللہ قنوجی کے ذکر میں ضمناً لکھا ہے کہ اس خانقاہ میں سات برس تک قیام رہا۔

تصنیفات

تصنیفات کی تفصیل سے پہلے یہ کہنا ضرور ہے کہ ان کی تصنیفات میں ہندوستان میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہیں فن رجال اور تاریخ اگرچہ مسلمانوں کا گویا خاص فن ہے لیکن ہندوستان کی علمی حالت کی کچھ ایسی افتاد پڑی تھی کہ ابتدا سے اس زمانے تک کسی نے ایک کتاب بھی اس فن میں نہ لکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے سینکڑوں ہزاروں علماء وفضلاء کے حالات پر آج گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے آزاد سب سے پہلے شخص ہیں جس نے ہندوستان کے علماء اور ارباب عمائم کے حالات قلمبند کیے۔ آزاد نے اس اولیت پر خود جا بجا فخر کا اظہار کیا ہے اور بجا کیا ہے!۔ اب تصنیفات کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

سروآزاد

شعر کا تذکرہ ہے۔

ید بیضا

یہ بھی شعرا کا تذکرہ ہے اور شاید سب سے پہلی تصنیف ہے۔ پہلا نسخہ سیوستان (سندھ) میں لکھا تھا۔ پھر ہندوستان پہنچ کر بہت کچھ تصرف کیا اور سنہ ۱۱۴۸ھ میں

دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ میں نے اس کتاب کا اصلی نسخہ ان کے ہاتھ کا لکھا دیکھا ہے۔

مآثر الکرام

خاص بلگرام اور عموماً فقراء اور علمائے ہندوستان کے حالات میں ہے۔ سنہ ۱۱۵۰ھ سے پہلے اس کی تصنیف کی ابتدا ہوئی تھی کہ سفر حج پیش آیا اور مسودہ ناتمام رہ گیا۔ سنہ ۱۱۵۲ھ میں جب اورنگ آباد میں آئے تو وطن سے مسودہ منگوا کر کتاب پوری کی۔

خزانہ عامرہ

خاص ان شعرا کے حالات میں ہے جن کو دربار شاہی

---

۱ ۔ سبحۃ المرجان صفحہ ۲۶

سے صلے میں ملے ہیں۔ اس میں ہندوستان کی تخصیص نہیں ہے سنہ ۱۱۷۶ھ کی تصنیف ہے جبکہ ان کی عمر ۷۱ برس کی تھی۔

روضۃ الاولیاء

صوفیہ کے حالات میں ہے۔

سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات

ثابت کیا ہے کہ سادات کا خاتمہ ضرور اچھا ہوتا ہے۔

دیوان عربی

کئی دیوان ہیں جن کی مجموعی تعداد تین ہزار شعر ہیں یہ چھپ بھی گئے ہیں۔

دیوان فارسی شرح بخاری

چند ابواب کی شرح ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بعض احباب کے کتب خانے میں موجود ہے۔

آزاد نے جابجا تصریح کی ہے کہ وہ ہندی یعنی بھاشا زبان سے پوری واقفیت رکھتے ہیں خزانہ عامرہ میں ابوسعد مسعود سلمان کے حالات میں لکھتے ہیں۔

''من اگر چہ دو دیوان دارم عربی و فارسی' لکن شر ہندی راخوب می فہمم داز چاشنی۔ چاشنی آن خط مستوفی دارم''۔

مسلمانوں پر یہ بڑا اعتراض ہے کہ انہوں نے اگرچہ تمام دنیا کے علوم وفنون کے ترجمے کیے لیکن کبھی زبان کی انشاء پردازی سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ انتہا یہ ہے کہ یونانی زبان جو مسلمانوں کے علوم کا اصلی سرچشمہ ہے۔ عربی نظم ونثر اس سے مطلق متاثر نہیں معلوم ہوتے۔ بے شبہ اس اعتراض کا جواب نہیں ہوسکتا لیکن اس اعتراض کے وزن کو فیضی و آزاد نے کسی قدر کم کردیا ہے۔ فیضی کی نل ومن میں ان نازک اور لطیف استعارات کا صاف پرتو ہے جو سنسکرت کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور آزاد نے تو سبحۃ المرجان میں ایک خاص باب باندھا ہے جس میں انہوں نے عربی زبان میں بھاشا کے خیالات اور شاعرانہ صنائع منتقل کیے ہیں۔ ان صنعتوں کی تعداد ۲۳ ہے اور عربی زبان میں آزاد نے ان کے یہ نام لکھے ہیں۔ تنزیہ تشبیہ الشی بنفسہ' تشبیہ البرہان' انتزاع تشبیہ البرہان' انتزاع تشبیہ السلب' تشبیہ القی' تشبیہ التقویہ' تشبیہ الاسغنا' تشبیہ التمنی' التفصیل علی التفصیل' تفصیل التعبیر برآعۃ الجواب' جمع الخزانہ وتفریقہا' قلب الماہیۃ الاستبداد' الطغیان' التسلط' الاعتساف' موالاۃ العدد' مخالطۃ التاویل اضمار النہی' التنوع' آزاد نے لکھا ہے کہ یہ صنعتیں ہندی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں جو عربی و فارسی میں نہیں پائی جاتیں باقی اور زبانوں میں بھی مشترک ہیں۔

آزاد نے ہندی کے بحور وقوافی کا بھی عربی سے مقابلہ کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ ہندی کی اکثر بحریں عربی و فارسی سے مختلف ہیں لیکن بحر تقارت' کفن الخلیل' اور بحر سریع' ہندی میں بھی ہے۔ ایک بڑا فرق یہ بتایا ہے کہ ہندی میں بعض بحریں ایسی ہیں جن کا قافیہ مصرع کے آخر کے بجائے وسط میں آتا ہے۔ اور باوجود اس کے یہ بحر مطبوع اور دلپسند ہے۔

تصنیفات مذکورہ میں سے سبحۃ المرجان اور مآثر الکرام تذکرہ علماء کی حیثیت سے قابل لحاظ ہیں۔ اگرچہ حالات نہایت اختصار کے ساتھ لکھے ہیں لیکن جو لکھا ہے کہ مستند لکھا

ہے۔قدما کے حالات میں اختصار کے لیے تو عذر موجود تھا کہ ماخذوں کا پتہ نہیں لیکن اپنے زمانے کے علماء کے حالات میں بھی نہایت اختصار برتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوتاہ قلمی ان کا خاصہ رہی ہے۔

شعرا کے تذکرے میں جو تین کتابیں لکھی ہیں ان میں سے خزانہ عامرہ زیادہ مفصل اور مبسوط ہے۔اس کے دیباچے میں کتاب کے ماخذ بتائے ہیں۔ان میں لب اللباب عونی یزدی کا نام بھی ہے۔ یہ کتاب ہماری نظر سے گزری ہے اور اس لے ہم کو افسوس ہوتا ہے کہ ایسے عمدہ ماخز سے آزاد نے پورا فائدہ نہیں اٹھایا تاہم خزانہ عامرہ میں بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کی داد دینی چاہیے۔

اول تو کثر شعرا کے ذکر میں ایسے شاعرانہ دلچسپ مباحث لکھے گ ء ہیں جن میں تنقید کی جھلک پائی جاتی ہے۔

دوسرے جا بجا ضمناً ایسے فوائد بیان کرتے جاتے ہیں جو تحقیقات علمی کی جان ہیں۔ شعرو شاعری کے نو دولت اکثر تصحیح الفاظ پر بہت جان دیتے ہیں۔اور ذرا سے تبدل وتغیر پر اس قدر ہنگامہ آرائی کرتے ہیں ک گویا وحی الٰہی کا کوئی لفظ ادل بدل ہو گیا ہے آزاد نے ایک موقع پر سینکڑوں الفاظ گنائے ہیں جو قاعدے کی رو سے بالکل غلط ہیں اور ناجائز ہیں۔ لیکن اساتذہ کے ہاں برابر چلے آتے ہیں'

مثلاً

اب بسکہ در مشق جنون رسوا شدم پیرا نہ سر
خند ند برمن نوخطان طفلان مکتب خانہ ہم
ظہور حسن تو امیتی بہ دوران داد
کہ بادشاہ زرعیت نمی ستاند باج

اے رنگ آمیز ایں گہرھا

دے از تو گزارش صورھا

نیست گردیوانہ جامی تعجب بہر چیست

کز عجائب ہائے دوران دیوار خاتم رسید

غمزہ درتاخت خوش کزیں نا اہل

گردد اسرار ہائے پنہاں فاش

باطل السحر مگر ورد زبانم گردد

کہ نگہ دارد ازان چشم فزوں سازمرا

بعض جگہ دقیق علمی مباحث بیان کیے جاتے ہیں جس سے ان کی علمی دقت نظر کا ثبوت ہوتا ہے۔ یہ سب ہے لیکن افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ جو چیز تذکرے کی جان ہے وہی نہیں۔ ایران میں تذکرے سے مقصود عمدہ اشعار کا انتخاب ہوتا تھا۔

۱۔ خزانہ عامرہ صفحہ ۴۰۷

چنانچہ ابتدائی تذکرے صرف انتخابات ہیں مرزا صاحب کا انتخاب آج بھی موجود ہے جس میں کسی شاعر کا حال برائے نام بھی نہیں۔ صرف اشعار ہی اشعار ہیں لیکن انتخاب اس درجے کا ہے کہ ہزاروں تذکرے اس پر نثار کردیے جائیں۔

دالہ داغشانی اور آتشکدہ آزر میں گو حالات بھی ہیں لیکن خصوصیات موجود ہے بخلاف ان کے خزانہ عامرہ بلکہ آزاد کے تینوں تذکرے گویا لغ اشعار کا مجموعہ ہیں تمام کتاب میں مشک سے ایک آدھ شعر اچھا نکل آتاہ۔ اس کی وجہ یہ ہے ہ اس زمانے میں تمام

ہندوستان کا مذاق شاعری سخت خراب ہو چکا تھا۔مضمون آفرینی یعنی جھوٹی خیال بندی پر لوگ جان دیتے تھے۔چنانچہ اس عہد کے جتنے تذکرے ہیں سب اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ خان آرزو کا مجمع النفائس اس عہد کا عمدہ ترین تذکرہ خیال کیا جاتا ہے۔اس کی بھی یہی حالت ہے یہ بدمذاقی اخیر تک قائم رہی یہاں تک کہ حضرت مرزا مظہر جان جانان نے ریزہ جواہر انتخاب کیا۔میں نے ثقات دہلی سے سنا ہیکہ مرزا غالب وغیرہ کا خیال تھا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا مذاق صحیح جو دوبارہ قائم ہوا۔وہ اس انتخاب نے قائم کیا۔

آزاد کا عربی اور فارسی کلام اگرچہ کثرت سے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے چہرہ کمال کا داغ ہے۔اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ عربی زبان کے بہت بڑے ادیب ہیں۔نہایت نادر کتب ادبیہ پر ان کی نظر ہے۔لغات اور محاورات ان کی زبان پر ہیں لیکن کلام میں اس قدر عجمیت ہے کہ اس کو عربی کہنا مشکل ہے ان کو اس پر ناز ہے کہ انہوں نے عجم کے خیالات عربی زبان میں منتقل کیے ہیں لیکن نکتہ سنج جانتے ہیں کہ یہ ہنر نہیں بلکہ عیب ہے۔

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

فارسی کی بھی یہی حالت ہے۔سینکڑوں ہزاروں اشعار ہیں ایک شعر بھی ایسا نہیں نکلتا جو اہل زبان کا کلام سمجھا جائے۔آزاد نے دالہ داغستانی کے حال میں لکھا ہے کہ ''چونکہ میری اور ان کی بہت کم صحبت رہی ہے اس لیے میں نے نہ ان کا ذکر سرد آزاد میں کیا اور نہ وانہوں نے میرا ذکر ریاض الشعراء میں کیا۔

اپنے خیال کے متعلق آزاد نے جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا۔لیکن دالہ داغستانی کی نسبت ان کا نرا حسن ظن ہے ورنہ داغستانی آزاد کے کلام کو اس قابل کب سمجھتا تھا کہ تذکرے میں درج کرتا۔اس نے جابجا تصریح کی ہے کہ ہندوستانی شعرا جس زبان مُں شعر کہتے ہیں خدا

جانے کس ملک کی زبان ہے۔

آزاد کے علمی کارناموں کے تذکرے میں مآثر الامراء کا ذکر قلم انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کتاب کتاب فن تاریخ میں اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک ایسی کتاب ہے جس کی نظیر عربی زبانمیں بھیبا وجود اس وسعت اور فراوانی مواد کے موجود نہیں۔صمصام الدولہ شاہنواز خان' نواب آصفجاہ دکن (مورث اعلائے حضور نظام دکن) کے امراء میں سے تھے۔انہوں نے ایک کتاب خاص اس موضوع پر لکھنی چاہی کہ بابر کے زمانے سے اخیر عہد تک دولت تیموریہ میں جس قدر عہدہ داران سلطنت گزرے ہیں سب کے حالات قلم بند کیے جائیں چنانچہ مآثر الامرا کے نام سے اس کتاب کی تدوین وترتیب شروع کی پورے پانچ برس اس کام میں صرف ہوئے اگرچہ امیر موصوف کا علمی پایہ خود اس قدر بلند تھا کہ جو ایسی تصنیف سے عہد برا ہونے کے لیے کافی تھا۔تاہم امارت کی راحت پرستی سے حسب دلخواہ سامان نہ ہوسکا۔امیر موصوف اس نکتے سے غافل نہیں تھے انہوں نے اس موقع پر آزاد کو یاد کیا۔یہ اس وقت اپنے وطن بلگرام میں تھے وہین قاصد بھجا اور سفر کے لیے ہر طرح کے سامان مہیا کیے۔میں نے حیدرآباد میں خود آزاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط دیکھا ہے جس میں وہ ایک دوست کو لکھتے ہیں کہ نواب صمصام الدولہ نے مآثر الامرا کا مسودہ بھیجا ہے کتاب اچھی ہے لیکن چونکہ ترتیب کے لحاظ سے سخت اصلاح کی محتاج ہے میں نے نواب موصوف کو لکھا کہ یہ کام اتنی دور سے انجام نہیں پاسکتا۔نواب نے میرے لیے پالکی کی ڈاک کا انتظام کردیا۔دو مہنے میں اورنگ آباد پہنچون گا۔اور مسودہ کو درست کروں گا۔اس زمانے کے امر کے علمی شوق کو دیکھو کہ ہزاروں کوس کے فاصلے سے اہل فن کو ان کاموں کے لیے بلواتے تھے بہرحال آزاد نے اورنگ آباد پہنچ کر کتاب کی اصلاح وترتیب کی۔لیکن بدقسمتی یہ کہ نواب موصوف ایک لڑائی میں مارے گئے۔اوران کے کتب خانے کے ساتھ یہ کتاب بھی اوراق

خزاں کی طرح برباد ہوگئی۔آزاد نے بڑے تفحص سے پورے ایک برس کے بعد مسودہ کا پتہ لگایا لیکن تمام اجزا درہم برہم ہو گئے تھے۔ بڑی مشکل سے اور دیدہ ریزی سے آزاد نے ان کی ترتیب کی لیکن قطب الملک عبداللہ خان کا حال سرے سے نہ تھا۔امیر الامراء حسین علی خان کا تذکرہ ابتدا سے ناقص تھا۔آصف جاہ ونظام الدولہ کا حال خود مصنف نے قلم انداز کر دیا تھا۔آزاد نے ان سب کے حالات خود لکھے اور کتاب میں شامل کیے۔ابوالفضل اور سعد اللہ خان کا حال بھی مسودہ میں نہ تھا۔غرض آزاد نے مسودہ کے اجزاء مرتب کیے۔ ناتمام حالات کی تکمیل کی حمد ونعت لکھی۔ انہی کی محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے تاریخی خزانے میں ایک ایسے نایاب جوہر کا اضافہ نظر آتا ہے اسی کے ساتھ ہم کو ایشیاٹک سوسائٹی کا ممنون ہونا چاہیے جس نے اس بیش بہا سرمایہ کو شائع کر کے عام کر دیا۔

معاصرین اور علمی صحبتیں

آزاد کا عہد وہ عہد تھا جب سلطنت تیموریہ کا آفتاب ڈھل چکا تھا۔ اس بنا پر علمی دربار کے ارکان بھی اس کے پایہ نہیں رہے تھے۔ تاہم ملا نظام الدین، محبّ اللہ بہاری، عبدالجلیل بلگرامی، شیخ علی خزین، خان آرزو، والہ داغستانی وغیرہ جیسے فاضل اور نکتہ سنج موجود تھے۔ آزاد کو ان میں سے اکثر شہروں سے صحبتیں رہیں ان صحبتوں میں ان کے فضل و کمال، اخلاق و عادات کے جوہر زیادہ کھلتے ہیں اس لیے ہم ان کو ذرا تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔

ایک دن نواب ناصر جنگ شہید کے ہاں (فرزند آصفجاہ) جن کا ذکر ذرا تفصیل سے آگے آتا ہے اہل سخن کا مجمع تھا کسی نے مرزا صائب کا یہ شعر پڑھا۔

اہل کمال رالب اظہار خامشی است
منت پذیر ماہ ناتمام از ہلال نیست

اس کے معنی میں سخت اختلاف ہوا اور واقعی اختلاف کا موقع تھا۔ ماہ تمام یعنی بدر کا ہلال سے منت پذیر نہ ہونا ایک بے معنی سی بات تھی حاضرین بڑے زور شور سے گرم مباحثہ تھے کہ دفعتاً آزاد نے کہا کہ یہاں ماہ تمام سے بدر مراد نہیں بلکہ پورے مہینے کا چاند مراد ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اہل کمال کا چپ رہنا بھی ان کے کمال کا اظہار کر دیتا ہے۔ لیکن اس دعوے کی شاعرانہ دلیل یہ ہے کہ جو مہینہ انتیس دن کا ہوتا ہے ماہ نو کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن جو ہمیشہ پورے تیس دن کا ہوتا ہے اس کو ہلال کی حاجت نہیں سب نے آزاد کے معنی فہمی کی داد دی۔

ایک دن نواب موصوف دربار میں آئے تمام شعراو فضلائے دربار مثلاً صمصام الدولہ' شاہنواز خان' موسوی خان' جرات اورنگ آبادی' رضوی خان' میر از جان رسا' نقد علی خان ایجاذ وغیرہ ہمرکاب تھے۔نواب نے تازہ غزل جو آزاد سے اصلاح پاچکی تھیں پڑھنی شروع کی۔ایک شعر میں سروکوخراماں باندھا تھا اس شعر پر سب کی نگاہیں معترضانہ اٹھیں۔نواب نے آزاد کی طرف دیکھا یعنی شعر آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔آزاد نے فوراً صائب کا شعر سند میں پڑھا۔

یک راہ برآراز آستین دست نگارین در چمن

تادستہا پنہاں کند سر و خرامان در بغل

جرأت نے کہا کہ مرزا صائب سے تعجب ہے کہ سروکوخراماں باندھا سرو چلتا پھرتا نہیں خراماں کیوں کر ہوسکتا ہے۔آزاد نے کہا شاعری کی بنیاد تخیل پر ہے۔شاخیں جو ہوا کے اشارے سے ہلتی ہیں۔جس سے درخت جھومتا ہوا نظر آتا ہے یہی درخت کا خراماں ہوتا ہے ۔عربی میں اسی لحاظ سے شاخ کو میاد کہتے ہیں صائب کے سوااور شعراء نے بھی سروکوخراماں باندھا ہے خواجہ حافظ فرماتے ہیں:

سرو از صبا گرد دچمان تاچوں قدت باشد رواں

ہر چند بخرامد باآں سرو خرامان کے رسد

شیخ علی حزین نے اس زمانے کے سب سے بڑے شاعر تھے۔جس زمانے میں وہ ایران سے چل کر ہندوستان جارہے تھے جب سیوستان پہنچے تو اتفاق سے آزاد سیوستان سے روانہ ہوکر وطن وک جارہے تھے راستے میں ایک مقام پر اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔بہت پر لطف صحبت رہی۔حزین اگرچہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن معلوم نہیں کس خیال سے آزاد کی بڑی قدردانی کی۔اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلیں آزاد کو تحفتہ دیں۔خان آرزو نے

حزیں پر جو اعتراضات کیے ہیں ان میں سے بعض کا جواب آزاد نے خزانہ عامرہ میں دیا ہے اور اچھی سندیں بہم پہنچائی ہیں۔

خان آرزو سے آزاد کی غائبانہ ملاقات تھی خان موصوف نے اپنے تذکرہ مجمع النفائس میں آزاد کا ذکر دو جگہ کیا ہے اور خوبی سے کیا ہے۔

شاہ آفرین لاہوری پنجاب کے مشہور شاعر تھے آزاد جس زمانے میں سندھ کی طرف جا رہے تھے۔ ۲۹ محرم سنہ ۱۱۴۳ھ میں لاہور میں ان سے ملاقات ہوئی۔ دوسری دفعہ سندھ سے واپس جاتے ہوئے رجب سنہ ۱۱۴۷ھ لاہور میں اترے اور پانچ دن تک قیام رہا۔ اس زمانے میں متعدد صحبتیں رہیں۔ آزاد ید بیضا لکھ چکے تھے آفرین نے بڑے اصرار سے اس کی نقل لی اور اپنی مثنوی انبان معرفت ان کی نذر کی۔

حاکم لاہوری شاہ آفرین کے شاگرد تھے اور دربار شاہی سے توسل رکھتے تھے۔ آخر ترک تعلق کر کے واقف لاہوری کے ساتھ حرمین کا قصد کیا۔ واقف بیمار ہو کر سورت میں رہ گئے۔ حاکم کو حج کی دولت نصیب ہوئی حج سے واپس آ کر حاکم اور واقف دونوں اورنگ آباد میں آئے۔ یہیں آرزو سے ملاقات ہوئی۔ حاکم نے یہاں رہ کر ایک تذکرۃ الشعرا لکھا جس میں صرف ان شعرا کا حال قلم بند کیا جن کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا تحفۃ المجالس نام رکھا۔ آزاد سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ موضوع کی مناسبت سے مردم دیدہ کا زیادہ مناسب ہوگا۔ حاکم پھڑک اٹھے اور یہی نام رکھا۔ خاتمے میں اس کا ذکر بھی کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

نسخہ تازہ کردہ ام تالیف
کہ ازو تازہ شد روان سخن
نام او کرد مردم دیدہ

آنکہ بودہ است رازدان سخن
اسم سامی او غلام علی است
سرو آزاد بوستان سخن

دالۂ داغستانی سے آزاد کی صحبت برآور نہ ہوئی۔ والہ اور آزاد کا ساتھ سفر میں ہوا۔ سیوستان سے دلی تک دونوں ہم عنان آئے۔ ایک دن عالہ نے آزاد سے کہا کہ آؤ ہم تم گھوڑے دوڑائیں۔ آزاد نے اول انکار کیا لیکن دالہ کے اصرار سے مجبور ہونا پڑا۔ دالہ کی سواری میں ایرانی گھوڑا تھا تاہم آزاد کے ہندی گھوڑے کا مقابلہ نہ کر سکا اور پیچھے رہ گیا دالہ نے نہایت برا مانا ایک دن آزاد نے یہ شعر پڑھا۔

زدہ ام برسر جہاں پاپوش
بے سبب این برہنہ پائی نیست

دالہ نے کہا کہ ہمارے ملک میں کفش کہتے ہیں۔ پاپوش نہیں کہتے۔ آزاد نے مرزا صائب کا یہ شعر پڑھا۔

چرخ دردے است کہ از خرمن من خاستہ است
خاک گردے است کہ افشاندہ پاپوش من است

ایک دن دالہ نے کہا کہ طیارہ کا لفظ طاحطی سے ہے یا تائے قرشت سے آزاد نے کہا کہ یراز محمد رفیع کے شعر سے مستنبط ہوتا ہے کہ طائے حطی سے ہے۔

دارد چومرغ عمرت پرواز بس بہ سرعت
اسباب عیس و عشرت طیار گو نہ باشد

میرزا سعید اشرف کا کلام بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

می پرد باز از ہوئے عشق اورنگ ازرخم

گرچہ بازنجیر موج بادہ طیارش کنم

نورالعین واقف سے بہت یارانہ تھا۔مختلف وقتوں میں آزاد نے ان کی بڑی مدد کی۔ ایک دفعہ ایک اورنگ آباد سے ہندوستان کو جارہے تھے۔ راستہ میں ڈاکہ پڑا۔ جو کچھ کائنات تھی سب جاتی رہی۔صرف ایک عینک اورتھوڑا سا پارجومہوسی کے شوق میں ساتھ رہتا تھا بچ گیا۔واقف نے پالاپور پہنچ کرآزاد کے پاس ایک قاصد بھیجااورحقیقت حال سے اطلاع دی۔خط میں یہ شعربھی لکھاتھا:

عینکے و پارہ سیماب با ماندہ است

چشم بیخواب و دل بیتاب با ماندہ است

آزاد نے ہنڈوی کے ذریعہ سے کچھ روپے بھیج دیے۔

(الندوہ جلد دوم نمبر۲)

اپریل سنہ۱۹۰۵ء

فرید وجدی بک

ہندوستان اور مصر کے مسلمانوں کی حالت اگرچہ اکثر باتوں میں ملتی جلتی ہے۔لیکن بعض حالات میں تعجب انگیز اختلاف ہے۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستان میں اب تک ہر قسم کی علمی، سیاسی، تمدنی کام جو انجام پائے ہیں وہ قدیم تعلیم یافتہ بزرگوں کے ہاتھ سے انجام پائے ہیں۔سرسید، نواب محسن الملک، نواب انتصار جنگ، آزاد، نذیر احمد، حالی قدیم طریقہ کے تعلیم یافتہ ہیں۔بخلاف اس کے مصر میں جو کچھ ہوا ہے یا ہو رہا ہے سب جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا زور دست و بازو ہے۔مصطفے کامل پاشا جو سیاست مصر کا علمبردار ہے قاسم بک امین جس نے سب سے پہلے جنس لطیف کی آزادانہ حمایت کی فرید وجدی بک جس نے فلسفہ حال اور اسلام کی تطبیق پر ایک وسیع لٹریچر پیدا کر دیا سب کے سب جدید تعلیم کی پیداوار ہیں۔

فرید وجدی بک کی تصنیفات کا چونکہ ہم نے بھی اپنی تصنیفات میں جا بجا ذکر کیا ہے۔اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے مختصر حالات ناظرین کو پیش کریں۔

فرید وجدی بک سنہ ۱۸۷۵ء میں بمقام سکندریہ پیدا ہوا۔ان کے والد کا نام مصطفے بک وجدی ہے جو نہر سویز کے محکمہ میں دکان کے منصف پر ممتاز تھے۔

فرید وجدی ۴ برس کی عمر میں سکندریہ کے ایک سکول میں مدرسہ اسمعیل آفندی کے نام سے مشہور ہے۔داخل ہوئے۔نویں برس میں اس مدرسہ کو چھوڑ کر انہوں نے حمزہ قبطان کے مدرسہ میں نام لکھوایا۔پھر مالینو فالو کے سکول میں داخل ہوئے۔سنہ ۱۸۸۲ء میں جب

ان کے والد سویز سے بدل کر قاہرہ میں آ گئے تو یہ بھی ان کے ساتھ آئے اور مدرسہ توفیقیہ میں داخل ہوئے۔ لیکن ان کے والد نے اس خیال سے کہ یہ جلد تعلیم سے فارغ ہو جائیں گے خانگی طور پر بھی تعلیم کا انتظام کیا۔ پھر ان کے والد دمیاط میں بھیج دیے گئے۔ یہ بھی والد کے ساتھ چلے آئے۔ یہاں انہوں نے معمولی درسی علوم چھوڑ کر خاص فلسفہ پر توجہ کی اور اسلام و فلسفہ کی مطابقت پر غور کرتے رہے۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء میں مذہب اور تمدن کی مطابقت پر ایک کتاب لکھی جس کا نام تطبیق الدیانۃ الاسلامیہ علیٰ نواسیس الطبیعۃ ہے۔

ان کے والد پھر بدل کر سویز آ گئے جہاں انہوں نے الحیواۃ کے نام سے ایک ماہوار پرچہ نکالا جو ایک مدت تک نکل کر بند ہو گیا اس میں عموماً مذہبی اور فلسفیانہ مضامین ہوتے تھے۔ لیکن چونکہ مصر کی آب و ہوا میں آج کل پالٹکس سرایت کر گئی ہے اسلیے یہ اس دائرہ میں محدود نہیں رہ سکے۔ اور ایک روزانہ پرچہ دستور کے نام سے نکالا جو نہایت دلیری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرتا تھا۔

فرید وجدی نے اس وقت تک جو کتابیں تصنیف کیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ تطبیق (اوپر گزر چکی ہے) یہ کتاب بھی فرنچ زبان میں لکھی تھی۔

۲۔ الفلسفہ الحقہ فی بدائع الاکوان

۳۔ الحدیقۃ الفکریہ فی اثبات اللہ بالبراہین الطبیعیۃ

۴۔ المراۃ المسلمۃ

۵۔ الاسلام فی عصر العلم، یہ بھی پانزدہ روزہ پرچہ تھا۔

۶۔ صفوۃ العرفان فی تفسیر القرآن۔

۷۔ سفیر الاسلام الی سائر الاقوام۔

۸۔ کنز العلوم واللغۃ، یہ گویا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ چالیس روپیہ قیمت ہے۔

ایک عجیب بات ہے کہ باوجود تعلیم جدید کے عورتوں کی آزادی اور خودمختاری کے متعلق اس کے خیالات جدید تعلیم کے بالکل مخالف ہیں قاسم بک امین کی کتاب تحریرالمراۃ کا اس نے جو جواب لکھا وہ درحقیقت لاجواب تھا۔

یہ بھی تعجب انگیز ہے کہ بخلاف عام جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے وہ فرائض مذہبی کا نہایت پابند ہے۔کسی وقت کی نماز میں کبھی تاخیر نہیں ہوسکتی۔شراب کو کبھی اس نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔کاش ہمارے ملک میں نوجوانوں میں بھی کوئی فرید وجدی ہوتا۔

فرید وجدی کے کمالات کے اعتراف کے ساتھ ہم کو کسی قدر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی مذہبی معلومات سطحی اور سرسری ہیں۔اس لیے جب وہ حدیث یا قرآن مجید کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو ان کی کم مایگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

(الندوہ جلد ۵ نمبر ۶)

ستمبر سنہ ۱۹۰۸ء

اختتام------------------The End